افکارِ ندوی

نو ید

مفکر اسلام علامہ ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ کے چشم کشا، ایمان افروز،
علمی، فکری، ثقافتی اور ادبی مضامین کا منتخب کردہ ایک حسین گلدستہ

تالیف

ضیاء الحق عبدالأحد

فاضل
جامعہ دار العلوم کراچی

دار الفوز
للطباعة والنشر والتوزيع

نام کتاب : افکارِ ندوی
مؤلف : مولانا ضیاء الحق عبد الاحد
0306-3834311
ziabassam124@gmail.com
اشاعت : بارِ اوّل جمادی الاولیٰ ۱۴۳۹ھ
فارمیٹنگ : www.typo.pk
0313-2228607
ناشر : دار الفوز للطباعة والنشر والتوزيع

ملک کے مشہور کتب خانوں میں دستیاب ہے۔

دار الفوز
للطباعة والنشر والتوزيع

Email: daralfauz@gmail.com
Web: www.al-fauz.com
+92-21-34611188

انتساب

اپنے والد ماجد کے نام جن کی تمنائے زندگی تھی
کہ اپنے جگر گوشوں کو دین کا کام کرتے ہوئے دیکھیں۔

اور

اپنے بڑے بھائی جان کے نام جن کی آغوش تربیت
میں پل کر کاغذوں کی یہ تپی سیاہ کرنے کے قابل ہوا۔

ضیاء الحق عبد الاحد

۱۴۳۸/۱/۱ھ

فہرستِ ابواب

عکسِ دروں

الٰہیات

پیغمبریات

اسلامیات

ثقافیات

مدرسیات

شخصیات

کتابیات

اداریات

ادبیّات

ندویّات



زبورِ عجم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

أزكى المحامد لخالق البرية الذي أبدع الأكوان بالألوان، وأزكى الصلاة على خير خلقه محمد ﷺ المبعوث إلى كافة البشرية بالحكمة والقرآن، وعلى آله وأصحابه الذين هم أهل العلم والعرفان، أمّا بعد!

اللہ تعالیٰ نے حضرت امام ابوالحسن علی الندوی رحمہ اللہ تعالیٰ کو جس علم، تقویٰ، طہارت، ادب، سوزِ دروں اور ان گنت کمالات سے نوازا تھا، اس کے بارے میں قلم فرسائی ہم جیسے طفلانِ مکتب کا کام نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی رگ وپے اور ہر قطرۂ خون، اور ہر لمحۂ حیات میں تب وتاب، سوزِ دل اور علم وادب ودیعت کر دیا تھا۔ وہ گذشتوں کے قافلۂ علم وعمل کا بچھڑا ہوا راہی اور اسی کارواں کے ادب وعربیت کے سالار ہیں۔ ان کی دور رَس نگاہیں، پختہ نظریات وافکار، ادبی شہ پارے کسی زبورِ عجم سے کم نہیں۔

حضرت ندوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی پاکیزہ تحریریں، ادبیت، روحانیت اور اخلاص وللّٰہیت کا حسین مرقّع ہیں، جن کے حرف حرف اور لفظ لفظ سے ایمان ویقین، محبت واخلاق کا خوبصورت احساس جھلکتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ میرے قلم میں ان کے اوصاف لکھنے کی سکت نہیں ہے، کیونکہ وہ ادبستانِ شبِ زدوں میں چراغِ سحر رکھنے والے ایسے دانشمند تھے جن کا ظہور صدیوں میں ہوا کرتا ہے۔

انہی علامہ ندوی رحمہ اللہ کی تالیفات وتحریرات کے شیدائیوں اور خوشہ چینوں میں برادرِ محترم مولانا ضیاء الحق بتاّم صاحب بھی ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے خوب علمی استعداد سے نوازا

ہے۔ اور وہ بیک وقت اردو، عربی، فارسی اور انگریزی کے علاوہ کئی زبانوں پر عبور رکھتے ہیں، جبکہ اردو عربی میں ان کی تحریر شعلۂ جوّالہ سے کم نہیں۔

موصوف نے اپنی تدریس کے دوران دبستانِ ندوی کی خوب سیر کی ہے اور گلہائے رنگارنگ کو چُن کر ایک خوبصورت گلدستہ تیار کیا ہے۔ اور اس میں انہوں نے ایسی ایمان افروز باتوں کو جمع کیا ہے جس کا ہر لفظ سوزِ دل اور ضمیر کی آواز ہے۔ اور ان تراشوں کو بجا طور پر ''افکارِ ندوی'' کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اور یقیناً ان کا حسنِ انتخاب لاجواب ہے۔ میری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ضیاء بسّام کو شایانِ شان جزاء عطا فرمائے اور ان کی اس ادبی اور علمی کاوش کو اپنی بارگاہ میں شرفِ قبولیت سے نوازے اور مولانا بسّام کے لیے زبردست علمی ترقیوں کا ذریعہ بنائے۔ آمین یاربّ العالمین۔

عبداللطیف معتصم طالقانی
ناظم تعلیمات جامعہ فاروقیہ کراچی، فیز ۲
۹/۳/۱۴۳۹ھ

حسنِ انتخاب

الحمد للہ و کفی و سلامٌ علی عبادہ الذین اصطفیٰ،

اَمّا بعد: ایک لکھاری کے لیے جتنی اہمیت اسلوبِ تحریر کی ندرت وانفرادیت کی ہے، کچھ اتنا ہی اہم موضوع کا انتخاب بھی ہے۔ "آپ کیسا لکھتے ہیں" کی طرح "آپ کیا لکھتے ہیں" کا بھی آپ کی شخصیت کے تعین میں بنیادی کردار ہوتا ہے، اور تحریر کو پذیرائی ملنے میں بھی اسی کا دخل ہے۔

امام بخاری کا اسلوب بڑا دلکش و دلنشین ہے، مگر صحیح بخاری کی عظمت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جس عہد میں ابو بکر بن ابی شیبہؒ کی "مصنَّف"، امام مالکؒ کی "موطا" اور امام احمد بن حنبل کی "مسند" وغیرہ احادیث کی مختلف النوع اقسام کے مجموعات معروف و متداول تھیں، صحیح مجرد کا پہلا مستند و معتبر نسخہ امام بخاریؒ کی عبقری شخصیت کے ہاتھوں وجود میں آیا، اور بجا طور پر چار دانگ عالم میں دھوم مچادی۔

علمی دنیا کی بے شمار کتابیں حسنِ انتخاب کے باعث ہی شہرت کی بلندیوں پر پہنچیں، اور فلاح وصلاحِ انسان کی عدیم النظیر مثالیں قائم کی ہیں۔

دنیا کی انقلابی شخصیات اور پرکشش ہستیوں کی مانگ زمان و مکان، بلکہ زندگی اور موت کی قیود سے بالاتر ہوتی ہے، ہر دور میں ان کی شخصیت قدر دانوں کا مرکز بنتی ہے۔ نگہ بلند اور سخن دلنواز رکھنے والوں کو نشانِ راہ دکھاتی ہے، اور نت نئے چیلنجز سے نمٹنے کا کامیاب پلان بتاتی ہے۔ یہ کاروانِ اہلِ نظر کی دقیق نگاہوں اور اہلِ دل کے خاص وجدان سے دیکھا اور محسوس کیا جاسکتا ہے، اور وہی ان سدا بہار شخصیات کے خوشہ چین ہوتے ہیں۔

علامہ سید ابوالحسن علی الندوی رحمۃ اللہ علیہ کی ہمہ جہت وانقلاب آفرین شخصیت محتاجِ تعارف وستائش نہیں ہے، ان کے قلم سے نکلے ہوئے علمی وادبی جواہر پاروں اور اصلاحی وتربیتی لٹریچر کی افادیت مسلّم اور ناقابلِ تردید ہے، اور اس کی شرح وبسط اور نشر وابلاغ کی ضرورت کل کی طرح آج بھی محسوس ہوتی ہے۔ اور یہ ان کی زندہ کرامت ہی تو ہے کہ ان کی محبت وعظمت ان دلوں

میں بھی جاگزیں ہے جو حضرت مرحوم سے کوئی زمینی اور زمانی قربت بھی نہیں رکھتے۔

مولانا ضیاء الحق عبد الاحد انہی خوش نصیبوں میں سے ہیں جنہوں نے ناقابلِ یقین گھاٹیاں عبور کرتے ہوئے مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے فاصلاتی استفادے کی زندہ وجاوید مثال پیش کی ہے۔ انہوں نے مولانا ندوی کے علوم ومعارف کا بڑی عرق ریزی سے مطالعہ بلکہ مراقبہ کیا، اور ان کے عرقِ صافی کو خود کے رگوں میں اتار دیا، اور خونِ جگر کو روشنائی بناکر افکارِ وانوارِ ندویؒ کو صفحۂ ہستی پر اتارنے کی ایک اچھی کوشش کی۔

یقیناً ایک نئی نویلی کاوش کا اور کہنہ مشق وسن رسیدہ کاریگری کا قدری فرق تو ہوگا، مگر ان کی تازہ دم وجواں سال محنت کی کرشمہ سازی بھی کم خوبصورت نہیں ہوگی۔

اربابِ ذوق مؤلفِ موصوف کی اس وقیع وجلیل کاوش کو یقیناً سراہیں گے اور طلبۂ علم کی خوبصورت لائبریریوں اور پسندیدہ کتابوں میں ایک بہترین اضافہ ثابت ہوگی۔

اپنی مزید خوبیاں اور رعنائیاں کتاب آپ کو خود دکھائے گی، آپ ضرور دیکھیے گا۔

مولانا عزیز الرحمٰن عظیمی صاحب
استاذِ حدیث وادب عربی
جامعہ بنوریہ العالمیہ، سائٹ کراچی، پاکستان

جہانِ علم و معنیٰ

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على سيّد الأنبياء والمرسلين، أما بعد:

ایک داعیٔ دین کی دعوت کی اثرپذیری میں تین عناصر بنیادی کردار ادا کرتے ہیں: علمی رسوخ، کردار کی پاکیزگی اور تحریر وتقریر پر عبور۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ ان تینوں عناصر کے جامع تھے، وہ داعیٔ دین تھے، اور صاحبِ اسلوب ادیب بھی۔ ان کی ہر تحریر پر دعوت کا رنگ غالب ہے، یہاں تک کہ ان کے سوانحی مضامین پر بھی اس داعیانہ شخصیت کا عکس نظر آتا ہے۔ ان کی تحریر کی شراہین میں حیویت و حرکت کی رَو دوڑتی محسوس ہوتی ہے جو پڑھنے والے کو بے چین کر دیتی ہے۔ الفاظ کا زیر و بیم، افکار و خیالات کی روانی اور ان کی بنیاد میں کار فرما مولانا کا درد و خلوص اس پر ابداع و ابتکار کا جنون طاری کر دیتا ہے۔ چنانچہ بیسویں صدی میں دعوت و ادب کے میدان میں جو طاقت ور لٹریچر سامنے آیا، اس میں مولانا کی تحریرات اس بناء پر سرِ فہرست رہیں گی کہ وہ قاری کے دل و دماغ میں اپنا اثر منتقل کرنے کی بے پناہ قوت رکھتی ہیں۔ انہوں نے ادب، تاریخ، سوانح، تفسیر و حدیث، الغرض گوناگوں موضوعات پر لکھ کر اسلامی ادب میں وقیع اور طاقتور لٹریچر کا اضافہ کیا۔ نوجوان قلم کار مولانا ضیاء بسّام نے اس لٹریچر کے بالاستیعاب مطالعے کے دوران کمال کا کام یہ کیا کہ وہ موضوعاتی ترتیب سے اس کا مواد الگ کرتے رہے، اور اس طرح ان کے منتخبات کا یہ حسین مرقع مرتب ہوا۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی کی شخصیت اور ان کے علمی آثار پر بہت کام ہوا ہے۔ یہ کتاب اپنی نوعیت میں ایک منفرد کام ہے۔ اسے مؤلف نے خصوصاً سے ان باذوق قارئین کے لیے مرتّب کیا ہے جو ادب اور دعوت و فکر کی دنیا میں سدا بہار پھول کھلانے کی تمنا رکھتے ہیں۔ اس کتاب کے مطالعے سے انہیں علی میاں مرحوم کی سوچ و فکر سے براہ راست واقفیت پیدا ہوگی۔ ان کی دلپذیر نثر پڑھتے ہوئے ان کے ذہن میں نئے نئے خیالات جنم لیں گے۔ ان میں ایک نیا شعور بیدار

ہو گا۔ نئے لہجے، نئے اسالیب اور نئے خیالات کا شعور، جس سے ان کا تخلیقی شعور پروان چڑھے گا۔

کتاب کیا ہے؟ سمجھ لیجیے جاندار موضوعات کا تنوّع ہے، اور اسالیب کی بوقلمونی۔ ڈھیر سارے موضوعات ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر چل رہے ہیں، اور قاری ایک ہی نشست میں جہانِ علم و معنی کی سیر کر لیتا ہے۔

مولانا ضیاء بسّام عربی و اردو زبان کے مشاق ادیب ہیں، سوچنا، لکھنا، پڑھنا اور پڑھانا ان کی زندگی کی سب سے بڑی سرگرمی ہے۔ میں اس وقیع علمی و ادبی کاوش پر انہیں ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں۔

حبیب حسین

استاذ ادبِ عربی و مدیر معہد اللغۃ العربیۃ،

جامعہ دار الہدیٰ، گلستانِ جوہر، کراچی

عظیم شخصیت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

گذشتہ صدی میں برِ صغیر میں جو چند اہم ترین شخصیتیں گذری ہیں، اور جنہوں نے علمی دنیا پر اپنے گہرے نقوش چھوڑے ہیں، ان میں ایک مفکرِ اسلام علامہ ابوالحسن علی الحسنی الندوی۔ رحمہ اللہ۔ (۱۳۳۳ھ - ۱۴۲۰ء) ہیں۔ آپ نے اپنی پوری زندگی مطالعہ و تحقیق، تعلیم وتدریس اور تصنیف و تالیف میں گذاری۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے کام میں اتنی برکت عطا فرمائی کہ جس سے متقدمین اور سلفِ صالحین کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ آپ نے عربی، اردو اور انگریزی میں دسیوں کتابیں تالیف کیں۔ قرآن وحدیث، سیرت وفقہ، تاریخ وادب آپ کے خاص موضوعات رہے۔ قرآن کریم سے متعلق "المدخل إلى الدراسات القرآنية"، "الصراع بين الإيمان والمادّية"، "تأملات في سورة الكهف"، "النبوة والأنبياء في ضوء القرآن".

علمِ حدیث سے متعلق "المدخل إلى دراسات الحديث النبوي الشريف"، عقیدہ سے متعلق "العقيدة والعبادة والسلوك"، "السيرة النبوية"، فقہ پر "الأركان الأربعة"، تاریخ پر "رجال الفكر والدعوة في الإسلام"، شخصیات پر "المرتضیٰ"، سوانح حضرت عبدالقادر رائے پوری، مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت، سوانح حضرت شیخ الحدیث، حیات عبد الحیؒ"، ادب میں "نظريات في الأدب، مختارات من أدب العرب، ما ذا خسر العالم بانحطاط المسلمين، روائع إقبال" ہیں۔

موصوف کی ادبیت کا اندازہ ان تین کتابوں سے ہوتا ہے:

۱ - ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمين

۲ - روائع إقبال

۳ - إذا هبت ريح الإيمان

موصوف کی علمی فضل وکمال اور وسعتِ مطالعہ کا اندازہ "تاریخ دعوت وعزیمت" سے ہوتا ہے۔ موصوف کے تفصیلی حالات کے لیے آپ کی خود نوشت سوانح "في مسيرة الحياة"، "کاروانِ زندگی" کا مطالعہ کریں۔ کئی ایک اصحابِ علم وفضل نے آپ کی ہمہ جہت شخصیت، علوم وافکار اور سوانح وتصنیف پر مستقل کتابیں تصنیف کی ہیں، ان میں سے چند ایک درجِ ذیل ہیں:

۱ - الشيخ أبو الحسن -كما عرفته - للدكتور يوسف القرضاوي

۲ - أبو الحسن علي الندوي الداعية الحكيم، المربي الجليل

۳ - يحدثونك عن أبي الحسن الندوي، الدكتور محسن عثمان الندوي

٤ - الأستاذ أبو الحسن الندوي كاتبًا ومفكرًا، الدكتور نذر الحفيظ الندوي

٥ - أبو الحسن الندوي الإمام المفكر الداعية المربي الأديب لسيد عبد الماجد الغوري

علامہ ابو الحسن علی الندوی -رحمہ اللہ- کے کئی علمی وادبی مقدمات تقاریظ ومقالات اور رسائل جن سے کئی ایک اب تک مخفی تھے، جنہیں آپ کے شاگردِ رشید الاستاذ عبد الماجد الغوری نے دار ابن کثیر دمشق سے ان ناموں کے ساتھ طبع کرایا ہے:

۱ - مقالات إسلامية في الفكر والدعوة

۲ - مقدمات الإمام أبي الحسن الندوي

۳- رسائل الأعلام إلى الإمام أبي الحسن الندوي

موصوف کی عربی تصانیف، رسائل اور تحریروں پر اہلِ عرب اور ندوہ کے علماء نے کافی کام کیا ہے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ آپ کی اردو تصانیف سے علم وحکمت کے شہ پاروں کو جمع کیا جائے تاکہ عوام وخواص میں جو آپ کی جملہ تحریرات کا مطالعہ نہ کرسکے تو ان کے سامنے مختصر وقت میں کشکول سے متعلق ایک جھلک سامنے آجائے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے مولانا ضیاء الحق عبد الاحد زید مجدہ (فاضل جامعہ دار العلوم کراچی) کو جنہوں نے موصوف کی جملہ اردو تصانیف کا نہایت عمق کے ساتھ مطالعہ کرکے دس ابواب کی صورت میں ان جواہر پاروں کو جمع کیا ہے۔ فاضل مؤلف کی عرق ریزی کا اندازہ مصادر ومراجع کی فہرست سے لگایا جاسکتا ہے۔

راقم جس سال جامعہ دار العلوم کراچی کی لائبریری میں مطالعہ کیا کرتا تھا اس دوران تقریباً ہر روز فاضل مؤلف سے ملاقات ہوتی تھی، موصوف مطالعۂ کتب سے متعلق راقم سے مشورہ لیتے تھے۔ عربی اردو ادب کے ساتھ موصوف کو گہری مناسبت اور خصوصی شغف ہے، ان کی یہ پہلی کاوش اس کی شاہد عدل ہے۔

ربّ ذو المنن اس محنت کو قبول فرمائے، فاضل مؤلف اور راقم کے لیے ذخیرۂ آخرت وذریعۂ نجات بنائے۔

محمد نعمان

جامعہ انوار العلوم، مہران ٹاؤن، کورنگی، کراچی

۵ ربیع الاول ۱۴۳۹ھ

۲۴،۱۱،۲۰۱۷ء

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

خشتِ اوّل

اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ علمی فکری نظریاتی ترقی کے لیے اولو العزم، بلند ہمت با ہمہ بے ہمہ شخصیت کی صحبت ضروری ہے۔

اگر ایسی شخصیت کی صحبت باآسانی میسر نہ ہو سکے تو نادرۂ روزگار ہستیوں کی کتابوں سے اپنی علمی تشنگی بجھانا ناگزیر ہو جاتا ہے۔

انہی گنی چنی شخصیات میں سے ایک عظیم المرتبت ہستی علامہ ابو الحسن علی الحسنی الندوی رحمۃ اللہ علیہ کی ہے جن کے دست اقدس سے ظلمت و جہالت میں بھٹکے ہوئے ہزاروں کو رشد و ہدایت کی راہ ملی۔

۱۴۳۸ھ میں راقم السطور نے تدریسی میدان میں قدم رکھا تو توفیق الٰہی نے دستگیری فرمائی کہ علامہ ابو الحسن علی الحسنی الندوی کی تقریباً تمام اردو کتابیں خریدیں اور حتی الامکان مطالعہ کرنے کی کوشش کی، دوران مطالعہ جو بات یا شہ پارہ دل کو بھاتا، من و عن زیب قرطاس کرتا جاتا۔ سال کے ختم ہوتے ہوتے اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہو گیا جسے منصّہ شہود پر لانے کی جسارت کر رہا ہوں۔

بڑی ناسپاسی ہو گی اگر اپنے محسنین کا شکریہ ادا نہ کروں خاص طور پر "استاذ جی"، اور برادر کبیر ادیب بے بدل میرے مشفق و محسن مولانا محمد بشیر مسرور زید مجدہ اور مولانا محمد امینی مدنی زید مجدہ اور وسیم بھائی اور تمام اکابر علماء کرام اور مشائخ عظام کا جنہوں نے دامے درمے قدمے قلمے سخنے میری مدد کی۔ ربّ کونین ان کو اجرِ جزیل عطا فرمائے۔

جمع و ترتیب تالیف، و تصنیف کے میدان میں راقم چوں کہ ایک طفل مکتب کی حیثیت رکھتا ہے مزید برآں یہ پہلی کاوش بھی ہے یقیناً فروگذاشتیں ہوں گی تو اس کی نسبت میری طرف ہو،

اور جو خوبی یا بھلی بات ہو اسے علامہ ندوی کی طرف منسوب کریں اور دوران مطالعہ جب کسی غلطی پر نظر پڑے تو المؤمن مرآة المؤمن کو مد نظر رکھتے ہوئے مطلع ضرور کریں۔ ان شاء اللہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا اور آئندہ ایڈیشن میں تصحیح کر دی جائے گی۔

والسلام

ضیاء الحق عبد الاحد
فاضل جامعہ دار العلوم کراچی

۳ ربیع الاول ۱۴۳۹ھ

۰۳۰۶-۳۸۳۴۳۱۱
ziabassam۱۲۴@gmail.com

الٰہیات

الٰہیات

سب کچھ خدا کا

یوں تو اس دنیا میں خدا کا دیا سب کچھ ہے۔ لیکن اگر اس بھرے بازار میں ایک دردِ محبت ہی کی دکان نہیں۔ جہاں سے قلب کی حرارت اور عشق کی دولت مل سکتی ہے۔ تو پھر دنیا ایک قمار خانہ اور زندگی محض "سود و سودا مکر و فن" ہے۔ اور اس میں وہی زیادہ کامیاب ہو گا جو اس فن میں طاق ہو گا۔

من کی دنیا من کی دنیا سوزومستی جذب و شوق
تن کی دنیا تن دنیا، سود و سودا مکروفن

اس زندگی کی آبرو، اور اس باغِ ہستی کی ساری بہار اور سارا وقار اور اس دنیا کا سارا ہنگامہ وجود اسی "دردِ محبت" کے دم سے ہے۔ اس کے بغیر یہ محفل سونی اور یہ گھر بے چراغ ہے خرمنِ کائنات میں یہی ایک کام کا دانہ ہے۔ اگر یہ نہیں تو پھر سب خس وخاشاک ہے۔

درخرمنِ کائنات کردیم نگاہ
یک دانہ محبت است باقی ہمہ کاہ

ہمیشہ سے ہے ہمیشہ رہے گا

اس کارخانہ قدرت کا ایک بنانے والا ہے۔ جو ہمیشہ سے ہے ہمیشہ رہے گا۔ وہ تمام خوبیوں، تعریف کی باتوں اور کمالات کا حامل اور ہر طرح کے عیوب و نقائص اور کمزوریوں سے پاک ہے۔ تمام موجودات اور تمام معلومات اس کے علم میں ہے۔ یہ پوری کائنات (Universe) اس کے ارادہ سے ہے۔ وہ زندہ ہے سمیع (سننے والا) بصیر (دیکھنے والا) ہے نہ کوئی اس کی طرح ہے نہ اس کا

کوئی مقابلہ اور برابری والا ہے۔ وہ بے مثال ہے وہ کسی مدد کا محتاج نہیں، کائنات کے چلانے اور اس کا انتظام کرنے میں اس کا کوئی شریک ساتھی اور مددگار نہیں، عبادت (یعنی انتہائی تعظیم) کا صرف وہی مستحق ہے۔ صرف وہی ہے جو مریض کو شفا دیتا، مخلوق کو روزی دیتا اور ان کی تکلیفوں کو دور کرتا ہے۔

اللہ کی محبت میں مزہ

ارشاد ہوا کہ اللہ کی محبت میں جو مزہ ہے وہ جنت کی چیزوں میں نہیں ہے۔ حور و قصور اور کھانے کی چیزیں اور حوض کوثر، ان سب کا مزہ اس مزہ کے روبرو کچھ نہیں ہے، عاشقوں کو جنت بھی اسی وجہ سے پسند ہوگی کہ اس میں اسی کا جمال ہے۔

عاشقاں را روزِ محشر با قیامت کار نیست
کارِ عاشق جز تماشائے جمال یار نیست

غالب ذات کا تقدیری فیصلہ

یہ بھی اللہ تعالیٰ کی حکمت اور اس علیم و غالب ذات کا تقدیری فیصلہ تھا کہ مسلمانوں کی سربراہی کے لیے رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد متصلاً آپ کے گھرانہ یا خانوادہ ہاشمی کا فرد خلیفہ نہیں ہوا۔ بلکہ آپ کی قائم مقامی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کی جو بنی تیم سے تھے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے جانشین حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہوئے جو بنی عدی سے تھے۔ اور ان کی قائم مقامی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کی جو بنو امیہ سے تھے، اس کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ اس وقت منصب خلافت پر فائز ہوئے، جس وقت صحابہ رسول بلکہ پوری امت میں ان سے افضل اور ان سے زیادہ مہمات خلافت کا بار اٹھانے والا کوئی دوسرا نہیں رہ گیا تھا۔ چنانچہ اس موقعہ پر شک و شبہ کی گنجائش ختم ہوگئی، اور کسی کا منہ نہیں رہا کہ وہ بدگمانی سے کام لے یا زبان اعتراض وطعن دراز کرے، اس لیے کہ معاملہ خالصتاً خاندانی اور گھریلو نہیں رہا، اور کسی اپنائیت اور عصبیت کا

الزام یا حوالہ دینے کا قطعاً موقعہ نہیں رہا، یہ سب تقدیر الٰہی اور حکمت ربانی کا مظہر تھا، وَ کَانَ اَمْرُ اللّٰہِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا۔

نیست سے ہست کرنا

اللہ تعالیٰ کے لحاظ سے کسی چیز کو نیست سے ہست کرنا اور پھر اس کو دوبارہ زندگی بخشنا، دونوں یکساں طور پر آسان ہیں۔ لیکن انسان کے لحاظ سے کسی چیز کا دوبارہ بنانا اس کے پہلی دفعہ بنانے سے بہر حال زیادہ آسان ہے اس لیے جس نے ایک بار خدا کی صفت خالق کا اعتراف کیا اس کیلئے اس صفت کے دوبارہ ظہور کا اعتراف کرنا بالخصوص جب کہ وہ مخلوق بالکل معدوم نہ بھی ہوئی ہو کچھ مشکل نہیں ہے۔

سنّت اللہ

سنت اللہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے کہ قوموں میں کس نگاہ تک اخلاص ہے۔ کتنا عزم ہے، کس قدر صلاحیتیں ہیں کچھ تقدیریں ہوتی ہیں، جو بدلتی رہتی ہیں اور بدلی جا سکتی ہیں۔ جن کو ہماری قدیم زبان میں تقدیر معلق کہتے ہیں۔ تقدیر معلق کا جہاں تک تعلق ہے بعض مرتبہ اگر دیکھنے والی آنکھیں ہوں اور قرآن کا گہرا مطالعہ ہو تو معلوم ہوتا ہے جیسے کاتب تقدیر منتظر ہے فیصلہ خداوندی کا، بعض اوقات کسی جماعت کے حق میں اور بعض اوقات کسی فرد کے حق میں کیا فیصلہ لکھے؟ وہ وقت ایسا ہوتا ہے کہ اس کا ایک لمحہ صدیوں کے برابر ہوتا ہے۔ اس کی ایک لغزش پوری پوری قوم کے سفینہ کو غرق کر دینے کے لیے کافی ہوتی ہے۔

افادہ، اللہ کی طرف سے

پہلی بات تو یہ سمجھئے کہ افادہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے اور یہ افادہ ہوتا ہے ان قلوب پر جو اللہ کی خشیت سے اور کلام ربانی کی ہیبت سے اور اس کے جلال سے معمور ہوتے ہیں۔ ان پر

اللہ کی طرف سے علوم کا ورود ہوتا ہے۔

پیغمبریات

پیغمبریات

آقائے نامدار ﷺ کی وفات

رسول اللہ ﷺ کی وفات کی خبر صحابہ کرام پر بجلی بن کر گری۔ یہ حضرات آپ کے دامنِ رحمت سے وابستہ اور دل سے شیدا و فریفتہ تھے۔ وہ آپ کی آغوشِ تربیت میں اس طرح رہے جیسے شفیق باپ کی آغوش میں اس کے بچے ہوں بلکہ اس سے بھی زیادہ ان پر قیامت گزر گئی۔

آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صاحبزادیاں

عبدالرزاق ابن جریج سے روایت کرتے ہیں کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ ﷺ کی سب سے چھوٹی صاحبزادی تھیں اور سب میں زیادہ آپ کو محبوب تھیں۔ ابو عمر (جن کی تصدیق سے دل مطمئن ہے) نے کہا کہ ان صاحبزادیوں میں سے سب سے بڑی زینب رضی اللہ عنہا تھیں، پھر رقیہ رضی اللہ عنہا، ان کے بعد ام کلثوم رضی اللہ عنہا اور ان کے بعد فاطمہ رضی اللہ عنہا۔

لختِ جگرِ رسول ﷺ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ام المومنین سے روایت ہے کہ "میں نے فاطمہ کو ایک مرتبہ آتے دیکھا تو ان کی چال بالکل رسول اللہ ﷺ کی چال کے مشابہ تھی"۔

بعثتِ محمدی کا ناقابل فراموش احسان

بعثتِ محمدی کا عظیم، ناقابل فراموش احسان اور گراں قدر تحفہ یہ انقلاب انگیز اعلان ہے کہ انسان کے اعمال و اخلاق اور ان سے پیدا ہونے والے نتائج کا اصل انحصار انسان کی ذہنی کیفیت،

عمل کے محرکات اور اس کے مقصد پر ہے۔ جس کو اسلام کی دین و شریعت کی زبان میں ''نیت'' کے ایک مفرد سادہ لیکن نہایت عمیق وسیع لفظ میں ادا کیا گیا ہے۔ اس کے نزدیک نہ کوئی چیز مستقل دنیا ہے نہ کوئی چیز مستقل دین، اس کے نزدیک خدا کی رضا کی طلب، اخلاص اور اس کے حکم کی تعمیل کے جذبہ وارادہ کے ساتھ بڑے سے بڑا دنیاوی عمل یہاں تک کہ حکومت، جنگ، دنیاوی نعمتوں سے تمتع، نفس کے تقاضوں کی تکمیل، حصول معاش کی جدوجہد، جائز تفریح طبع کا سامان، ازدواجی و عائلی زندگی، سب تقرب الی اللہ کا ذریعہ، اعلیٰ سے اعلیٰ مراتبِ ولایت تک پہنچنے کا وسیلہ اور خالص ''دین'' بن جاتی ہے۔ اس کے برخلاف وہ بڑی سے بڑی عبادت اور دینی کام جو رضائے الٰہی کے مقصد اور اطاعت کے جذبہ سے خالی ہو، اور خدا فراموشی اور غفلت کے ساتھ ہو (حتیٰ کہ فرض عبادتیں، ارکان اسلام، ہجرت و جہاد، قربانی اور سرفروشی اور ذکر و تسبیح) خالص دنیا اور ایسا عمل شمار ہوگا جس پر کوئی ثواب اور اجر نہیں ہے بلکہ وہ بعض اوقات وبال کا موجب اور خدا سے دوری کا سبب ہو جائے گا۔

انبیاء علیہم السلام تمام آلائشوں سے پاک وصاف

خون اور رشتہ کا تقدس، نسلی و خاندانی غرور، اپنے بیٹوں اور پوتوں کے لیے پیشوائی کی گدی قائم کر جانا اور ان کے لیے بڑی بڑی حکومتوں کی بنیاد ڈالنا، اور دائمی سیادت وقیادت کی سند قائم کرنا جو ان کی اولاد میں نسل در نسل منتقل ہوتی رہے۔ ان کے مالی مفادات کو صدیوں کیلئے محفوظ کر جانا، اور اس کا انتظام کر جانا کہ ہمیشہ کیلئے ان کے مافوق البشر ہونے کا عقیدہ لوگوں کے دلوں میں جاگزیں رہے۔ اور ان کے امتیازات کے گن گائے جاتے رہیں۔ بانیان سلطنت، حوصلہ مند قائدین، دنیا طلبوں اور مادی منافع کے پرستاروں کی نفسیات رہی ہے۔ جن کی مثالیں بکثرت حکومتوں اور شاہی خاندانوں کی تاریخ میں زمانۂ قدیم میں ملتی ہیں۔ انبیاء علیہم السلام ان باتوں سے ماوراء، اور ان کی ذات گرامی ان تمام آلائشوں سے پاک وصاف ہوا کرتی ہے۔

مسلمانوں کا مرکز توجہ

مسلمانوں کے مختلف فرقوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے اور شیعہ سنیوں کے درمیان وسیع اور گہری خلیج پر کرنے کے لیے ضروری ہے کہ جذبات و تعلق کے اس کرنٹ کو رسول اللہ ﷺ کی شخصیت اور آپ کی نبوت کی طرف موڑ دیا جائے۔ اس لیے کہ آپ کی ذات گرامی مسلمانوں کا مرکز توجہ ہے، اورآپ کی نبوت ہی سے چشمہ ابلتا ہے اور آپ ہی وہ روشن چراغ ہیں جس نے پوری دنیا کو منور کیا ہے یہ ایسا عظیم الشان تجدیدی کام ہے جس کے لیے نہایت قوی ارادہ، صاحب عزم، بلند ہمت مصلحین و مفکرین کی ضرورت ہے۔ جب بھی یہ کام پورا ہو گا اسلام کی فکری اور تجدیدی تاریخ میں ایک انقلاب انگیز اور بے نظیر کارنامہ ہو گا اسی ٹھوس اور مستحکم بنیاد پر حقیقی اور فطری اسلامی اتحاد قائم ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ہر کوشش مصنوعی اور غیر فطری ہو گی۔

اصل سرچشمہ اور مرکز کی طرف رجوع

حقیقت تو یہ ہے کہ انتشار و افتراق سے بچنے اور اختلافات کو ختم کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اصل سرچشمہ اور مرکز کی طرف رجوع کیا جائے، اس لیے کہ جب بھیڑوں کا ریوڑ انتشار و پراگندگی کا شکار ہو جاتا ہے تو ان کو ایک جگہ جمع کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مرکز کی طرف رجوع کیا جائے۔ جیسا کہ حدیث میں آتا ہے کہ "بھیڑیا اس بکری کو اپنا لقمہ بناتا ہے جو اپنے ریوڑ سے علیحدہ ہو" اس لیے جنگل میں منتشر بھیڑوں کو بھیڑیوں کا لقمہ بننے سے بچانے کیلئے ان کے راعی و محافظ کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ اور اس کی سرکردگی و نگرانی میں اس بکھرے ہوئے شیرازہ کو یکجا کرنا ہو گا۔

انبیاء کرام علیہم السلام فطرت کے نبّاض

انبیاء فطرت کے نباض اور انسانیت کے مزاج داں طبیب ہیں، جس تمدن کا خمیر ان کی ترکیب اور ان کے مشورے کے بغیر تیار ہو، اس میں کبھی اعتدال نہیں ہو سکتا۔ اس کے مزاج کا عدم توازن کبھی نہ جائے گا۔ ایسا تمدن جتنی ترقی کرے گا اس کے چھپے ہوئے عیوب اتنے ہی نمایاں ہوتے جائیں گے، اور اس کی بے اعتدالیاں جو اس کی فطرت میں داخل ہیں اتنی ہی ابھرتی جائیں گی۔

انبیاء کی تعلیمات

آج دنیا میں جتنے بھی بلند انسانی اقدار، لطیف و نازک احساسات بہترین و بلند اخلاقی تعلیمات، صحیح و نفع بخش علوم، یا باطل سے ٹکرانے کے عزائم پائے جاتے ہیں۔ ان تمام کی تاریخ کا سلسلہ وحی آسمانی، انبیاء کی تعلیمات، ان کی دعوت و تبلیغ، ان کے مجاہدات، اور ان کے پُر خلوص اصحاب و متبعین ہی پر ختم ہوتا ہے اور دنیا (ازل سے ابد تک) ان کے دستر خوان کی ریزہ چینی پر مجبور رہی ہے۔ انہی کی پھیلائی ہوئی روشنی میں قدم بڑھاتی رہی ہے اور انہی کی تعمیر کی ہوئی محکم عمارت کے سائے میں سر چھپاتی اور زندگی گزارتی رہی ہے اور رہے گی، ان مقدس نفوس پر ہزاروں ہزار بار درود اور سلام۔

بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے
یہ سب پود انہیں کی لگائی ہوئی ہے

اتالیق اعظم کی انگلی

جس وقت اس نادان کمسن بچے (امت) نے اس اتالیق اعظم، اس مربیٔ اکبر، اس دانا جہاندیدہ کی انگلی چھوڑ دی وہ پیچدار گلیوں میں بھیڑ میں پڑ گیا وہ جتنا چلتا ہے اپنے گھر سے دور ہوتا

جاتا ہے چلاتا ہے روتا ہے، مگر کوئی اس کا ہاتھ نہیں پکڑتا، وہ بھوکا ہے، پیاسا ہے مگر کسی کو اس پر ترس نہیں آتا۔

اسلامیات

اسلامیات

اسلام ابدی دین ہے

اسلام ابدی اور خدا کا پسندیدہ دین اور امت مسلمہ اس کا شاداب اور سدا بہار درخت ہے۔ یہ خدائی ترکش ہے، نہ اس کے تیر ختم ہوتے ہیں اور نہ نشانہ خطا ہوتا ہے۔ سب سے بڑا ثبوت اس امت میں ایسے مصلحین و مجاہدین خداداد صلاحیتوں سے مالا مال، مؤید من اللہ، نادرۂ روزگار اور اسلام کے لیے باعث صد افتخار شخصیتیں ہیں۔ ناساز گار حالات، مخالف ماحول اور بیم ورجا کی تیرہ و تاریک فضا میں ایسی قوم میں پیدا ہوتی ہے جو فکری زوال واضمحلال، روحانی افلاس، ارادہ کی کمزوری، عزم وہمت کی پستی، اخلاقی فساد، راحت طلبی وعافیت پسندی، ہر قوت وطاقت کے سامنے سپر اندازی اور اصلاح حال سے مایوسی کا شکار ہوتی ہیں۔ اس وقت یہ پوری نسل ایک ہی سانچہ میں ڈھلی ہوتی ہے، بالکل ایسے ہی جیسے ایک پریس سے شائع ہونے والی کتاب کا کوئی ایڈیشن ہو کہ جس کے ایک نسخے کو پڑھ کر باقی سارے نسخوں کے بارے مین رائے قائم کی جا سکتی ہے۔

اسلام کی خصوصیت

عام طور پر صدیوں کا آغاز کسی بڑی شخصیت کی پیدائش یا وفات، قیام سلطنت یا عظیم فتوحات سے ہوا ہے، اور اس سے ایک مستقل تقویم (جنتری) وجود میں آئی ہے لیکن اسلام کی یہ خصوصیت ہے کہ اس نے دین کا نام بھی اپنے پیغمبر کے نام پر نہیں رکھا، بلکہ پیغام پر رکھا ہے۔ اسی طرح تقویم کو بھی کسی شخصیت یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کی شخصیت سے بھی مربوط نہیں کیا جو تاریخ انسانی کی عظیم ترین شخصیت ہے۔ اللہ اور مسلمانوں کے نزدیک محبوب ترین نام ہے۔

اسلامی فتوحات سے بھی مربوط نہیں کیا۔ ہجرت سے اس تقویم کا آغاز ایک خاص فکر اور بڑی حکمت پر مبنی ہے کیونکہ اس تقویم پر ایک پیغام اور ایک دعوت کی ہمیشہ کے لئے چھاپ پڑگئی، اس طرح جو بھی تقویم کی ابتداء کو جاننا چاہے گا اس کو معلوم ہو گا کہ بنیادی نقطہ آغاز اور قابل ذکر عظمت اور یادگار کے لائق چیز صرف عقیدہ اور ایمان ہے اور عقیدہ کو تمام پسندیدہ اور قابل فخر ومباہات امور پر ترجیح دینا اس کا شعار ہے اس کے اندر ایک فال نیک اور خوش خبری کا بھی پہلو بھی ہے کہ یہ نسل انسانی کی تاریخ میں ایک عہد جدید کی ابتداء اور قافلہ انسانیت کا نقطہ آغاز ہے۔ عقیدہ پر کاربند رہنے اور اصول کو ہمیشہ سامنے رکھنے اور اس کی خاطر ہر قسم کے خطرات مول لینے کا سبق بھی اس سے ملتا ہے اور یہ کہ اصول وعقیدہ کو ہمیشہ عرفی وطبعی امور پر ترجیح حاصل ہوتی۔

اسلام عرب کی سرزمین پر کیوں نازل ہوا؟

بہت دن ہوئے لاہور میں علامہ اقبال کی زبان سے ایک گفتگو سنی تھی۔ موضوع کچھ اس طرح کا تھا۔ اسلام عرب کی سرزمین پر کیوں نازل ہوا؟ فرمایا تھا کہ عرب کے نصیب سفر وصحرا گردبدوی کبھی متمدن نہیں ہوئے۔ تمدن وتہذیب بالآخر امتوں کے زوال کا باعث ہوئی ہے۔ اس لیے اسلام کی امانت کسی ایسی قوم یا سرزمین کو نہیں سونپی جاسکتی تھی۔ جو تمدن کے لائے ہوئے عیش وعشرت کا شکار ہوسکتی تھی۔ چنانچہ عرب سے باہر مسلمان جب کبھی زوال کی زد میں آئیں گے، روشنی حرارت اور حرکت حاصل کرنے کے لیے عرب کے ریگزار اور اس کے سخت جان اور سخت کوش بادیہ پیماؤں کی طرف رجوع کریں گے۔ آج یہ مقولہ یاد آرہا ہے عرب کے ان صحرانشینوں کے بارے میں کچھ نہیں کہتاع

بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی

لیکن خود عرب کے دیوان ہائے حکومت، عشرت کدوں، باہر کے لوگوں اور حکومتوں میں

ان کی جیسی اور جتنی وقعت رہ گئی ہے اسے دیکھ کر بڑی غیرت آتی ہے اور عبرت ہوتی ہے۔

اسلام اور اس کی ضیاء پاشیاں

اسلام آیا اور اس کی ضیاء پاشیوں نے روئے زمین کے گوشہ گوشہ کو منور کیا۔ اسلام کی نعمت ساری انسانیت کے لیے عام تھی۔ وہ اس بارش کی طرح تھی جو سپید و سیاہ اور بندہ و آقا کے درمیان امتیاز نہیں کرتی۔ وہ تو بادل تھا جو پست و بلند گلشن و صحرا سب کو سیراب کر گیا۔ اور حق تو یہ تھا کہ اسے عربی شاعر کے اس قول سے مخاطب کیا جائے۔

فاذهب كما ذهب غوادي مزنة
اثنیٰ عليها السهل والأوعار

ایک فارسی شاعر کا قول ہے جو زیادہ بلیغ ہے۔

پر تو مہر بوریا نہ و آباد یکیست
حسن چون تیغ کشد بندہ و آزاد یکیست

اس نعمت سے عظیم تر کوئی نعمت نہیں، یہاں تک کہ زندگی بھی جو ہر لذت و سرور کا سرچشمہ ہے۔ اگر اسلام توحید خالص اور ایمان کی نعمت نہ ہوتی تو یہ زندگی ایک عذاب مسلسل ہوتی، اور اس کی حیثیت جہنم تک پہنچنے کے لیے ایک پل سے زیادہ نہ ہوتی۔

اللہ تعالیٰ نے اسلام کی نعمت سے ہمیں نوازا۔ اس کا لاکھ لاکھ شکر ہے اور اس نعمت کے حصول میں ہم پر نبی ﷺ کی ذات گرامی اور آپ کی بعثت و رسالت اور دعوت و جہاد کا ناقابل فراموش احسان ہے۔

اسلامی تہذیب

اسلامی تہذیب کے سوا کوئی ہماری تہذیب نہیں۔ اسلامی تاریخ کے سوا کوئی ہماری تاریخ

نہیں۔ اسلام کے عطا کردہ عزت و سربلندی کے علاوہ ہمارے لیے کوئی عزت و سربلندی نہیں ہم تمام محمد ﷺ کے طفیل جی رہے ہیں۔

اسلام، اللہ کا آخری دین

اسلام اللہ کا آخری دین ہے، جس پر قیامت تک کے لیے انسانوں کی نجات اور ہدایت منحصر ہے۔ اور جس کو ان کی دینی و دنیوی رہنمائی کے لیے قیامت تک باقی رہتا ہے۔ اس کے عقائد و حقائق ناقابل تغیر و تبدل اور اس کی تعلیمات و احکام ناقابل تنسیخ و ترمیم ہیں۔ اس کی نہ صرف شریعت (منزل من اللہ) بلکہ اس کی تہذیب و تمدن کی بھی "حقائق ابدی" پر اساس ہے۔

تاریخ اسلام سے نامکمل واقفیت

جس شخص کے قلم سے بھی ایسی تحریر نکلے جس سے یہ غلط تاثر پیدا ہو کہ تاریخ اسلام تاریک و ویران، امت محمدیہ تخلیقی صلاحیت سے محروم رہی ہے۔ اور عالم اسلام میں تاریکی اور انحراف و گمراہی کا دور دورہ رہا ہے تو اس شخص کے فیصلے کو جلد بازی کا فیصلہ اور اصلاح و تجدید کی تاریخ سے نامکمل واقفیت پر محمول کیا جائے گا۔

تاریخ اسلام میں اصلاح و تجدید کی کوششوں کا تسلسل

خود تاریخ کا دیانتدارانہ اور وسیع و عمیق مطالعہ (جو عرفی تقلیدی تاریخ کی کتابوں اور مشہور متداول مطبوعات میں محدود نہ ہو) اس بات کی تردید کرتا ہے، اور ثابت کرتا ہے کہ اصلاح و تجدید کی کوششیں، جاہلیت اور ظلمت سے کشمکش، باطل تحریکوں، وقت کے فتنوں، اسلام پر اندرونی و بیرونی حملوں، اسلام دشمن طاقتوں کی سازشوں اعتقادی و فکری ضلالتوں، عملی و اخلاقی انحرافات و بے عنوانیوں سے نبرد آزما ہوئی اور ان کے مقابلہ میں صف آرائی کا سلسلہ، جو ہر اسلام اور روح اسلام کو مصفی اور منقح پیش کرنے کی کوشش غیر منقطع اور مسلسل طریقہ پر جاری رہی۔

اس سلسلہ میں اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ کا کوئی جفاکش اور بلند ہمت طالب علم جس نے اس کو اپنے غور و مطالعہ کا موضوع بنایا ہے، اگر پورے احساس و ذمہ داری و فرض شناسی کے ساتھ اس کا دعویٰ کرے کہ اس طلائی زنجیر کی ہر کڑی پہلی کڑی سے پیوست ہے اور اس کی کوئی کڑی گم نہیں ہے تو اس کو محض خوش اعتقادی اور امت کو ذہنی فریب دینے کا الزام ہرگز نہیں دیا جا سکتا، یہ دراصل تاریخ اسلام کا نقص نہیں، تاریخ نویسی کا نقص ہے۔ اور کسی موضوع پر مکمل و مرتب شکل میں کسی تاریخی دستاویز کا موجود نہ ہونا اس کا ہرگز ثبوت نہیں کہ اصل واقعات و مواد اور تاریخی شہادتیں بھی ناپید ہیں، یہ علمی و تحقیقی تاریخ کا ایک ایسا تجربہ ہے۔ جس سے تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں اور تاریخ پر کام کرنے والوں کو بار بار سابقہ پڑا ہے۔ تاریخ کی زبان اور پیرایۂ بیان سے ہٹ کر منطق و کلام کی زبان میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے یہ الفاظ ایک علمی حقیقت کی حیثیت رکھتے ہیں کہ ''عدمِ علم 'عدمِ وجود' کو مستلزم نہیں'' یعنی یہ ضروری نہیں کہ جس چیز کا علم نہ ہو وہ چیز سرے سے موجود ہی نہ ہو۔ اگر ان صلاحی و تجدیدی کوششوں کے تسلسل کا کسی ایسے فاضل کو علم نہیں جس کو اس کے مخصوص حالات، ذوقِ طبیعت اور مشاغل نے اس موضوع پر اختصاصی طریقہ پر مطالعہ کا موقعہ نہیں دیا تو اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ یہ اصلاحی و تجدیدی کوششیں سرے سے ہوئی ہی نہیں۔

اسلام کا نمایاں شعار

دین اسلام کا سب سے پہلا امتیاز اور نمایاں شعار ''عقیدہ'' پر زور اور اصرار اور سب سے پہلے اس کا مسئلہ حل کر لینے کی تاکید ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم النبیین محمد ﷺ تک تمام انبیاء کرام ایک معین عقیدے کی (جو ان کو وحی کے ذریعہ ملا تھا) دعوت دیتے اور اس کا مطالبہ کرتے رہے، اور اس کے مقابلہ میں کسی مفاہمت، یا دست برداری پر تیار نہ ہوئے۔ ان کے نزدیک بہتر سے بہتر اخلاقی زندگی اور اعلیٰ سے اعلیٰ انسانی کردار کا حامل نیکی و

صلاح، سلامت روی اور معقولیت کا زندہ پیکر، اور مثالی مجسمہ خواہ اس سے کسی بہتر حکومت کا قیام، کسی صالح معاشرہ کا وجود اور کسی مفید انقلاب کا ظہور ہوا ہو۔ اس وقت تک کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا، جب تک وہ اس عقیدے کا ماننے والا نہ ہو جس کو وہ لے کر آئے، اور جس کی دعوت ان کی زندگی کا نصب العین ہے، اور جب تک اس کی یہ ساری کوششیں اور کاوشیں صرف اس عقیدہ کی بنیاد پر نہ ہوئی۔ یہی وہ حد فاصل ہے اور واضح و روشن خط ہے جو انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی دعوت اور قومی رہنماؤں، سیاسی لیڈروں، انقلابیوں اور ہر اس شخص کے درمیان کھینچ دیا گیا ہے جس کی سر چشمۂ فکر و نظر انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی تعلیمات اور سیرتوں کے بجائے کوئی اور ہو۔

حقیقتِ اسلام، مدتوں سے میدان میں آئی ہی نہیں

عرصہ دراز سے صورت اسلام معرکہ آزما ہے، اور شکست پر شکست کھا رہی ہے اور حقیقت اسلام مفت میں بدنام اور دنیا کی نگاہوں میں ذلیل ہو رہی ہے۔ دنیا سمجھ رہی ہے کہ ہم اسلام کو شکست دے رہے ہیں اس کو خبر نہیں کہ حقیقت اسلام تو مدت سے میدان میں آئی ہی نہیں، اس کے مقابلہ میں مسلمانوں کی صرف صورت ہے نہ کہ اسلام کی حقیقت۔

یورپ کی قوموں کے مقابلہ میں ترکی میدان میں آیا۔ لیکن اسلام کی ایک نڈھال صورت لے کر، یہ نحیف و نزار صورت مقابلہ میں نہ ٹھہر سکی۔ فلسطین میں تمام عرب قومیں اور سلطنتیں مل کر یہودیوں کے مقابلہ میں آئی لیکن حقیقتِ اسلام، شوقِ شہادت جذبۂ جہاد اور ایمانی کیفیات سے اکثر عاری عربی قومیت کے نشے میں سرشار صرف اسلام کے نام و نسبت سے آراستہ، نتیجہ یہ ہوا کہ اس بے روح صورت نے یہودیوں کی جنگی قوت و تنظیم و اسلحہ کی حقیقت سے مات کھائی۔ اس لیے کہ صورت حقیقت کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ یہودی ایک حقیقت رکھتے تھے اگرچہ سرتاپا مادی، عرب صرف ایک صورت رکھتے تھے اگرچہ مقدس، لیکن صورت صورت ہے اور

حقیقت حقیقت ہے۔

امت کی سب سے بڑی خدمت

پس اس وقت سب سے بڑا کام اور امت کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ اس کے عموم اور سوادِ اعظم کو صورت سے حقیقت کی طرف سفر کرنے کی دعوت دی جائے، صورتِ اسلام میں روح اسلام اور حقیقت اسلام پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی۔ اس وقت امت کی سب سے بڑی احتیاج یہی ہے۔ اسی سے اس کے سب حالات اور اس کے نتیجہ میں دنیا کے حالات بدلیں گے۔ دنیا کے حالات اس امت کے حالات کے اور اس امت کے حالات اس حقیقت کے تابع ہیں۔ یہ امت حضرت مسیح علیہ السلام کے الفاظ میں زمین کا نمک ہے۔ دیگ کا مزہ نمک کے تابع ہے اور نمک کا مزہ اس کی نمکینی پر موقوف ہے۔ اگر نمک کی نمکینی ختم ہو جائے تو وہ نمک کس کام کا؟ اور پھر کھانے کو خوش ذائقہ بنانے والی چیز کہاں سے آئے گی؟ آج ساری زندگی بے کیف اور بے روح ہے اس لیے کہ اس امت کی بڑی تعداد حقیقت سے عاری اور روح سے خالی ہے پھر زندگی میں روح اور حقیقت کہاں سے آئے گی؟

اسلام ایک عقیدہ کی حیثیت

اس وقت اسلام ایک عقیدہ کی حیثیت سے موجود ہے۔ لیکن اس کو اس کے تمدن سے محروم کر دیا گیا ہے۔ اور یہ مغرب کی بہت بڑی سازش ہے کہ اس نے جب یہ دیکھا کہ مسلمانوں کو عقیدہ سے ہٹانا مشکل ہے اور ان کے احساسات اس کے بارے میں بہت تیز ہیں، اس کو اس کے بہت تلخ تجربے ہوئے ہیں، جنگ صلیبی سے لے کر اسپین کی نسل کشی اور مسلمانوں کی کلی اخراج سے لے کر اس وقت تک تو اس نے اپنے ان تجربوں سے فائدہ اٹھایا اور اس نے یہ حکمت عملی (STRATEGY) طے کی کہ مسلمانوں کو ان کے عقیدہ سے ہٹانے کے بجائے ان کے تمدن سے اور ان کے نظام معاشرت سے علیحدہ اور محروم اور اس پر آمادہ کر دینا چاہیے کہ وہ دوسرا

تمدن اختیار کرلیں۔ اور اس میں میں سمجھتا ہوں کہ یورپ بڑی حد تک کامیاب ہو گیاہ۔ خدا کے فضل سے اسلامی عقائد کے بارے میں کوئی تحریف واقع نہیں ہوئی ہے جیسا کہ عیسائیت میں واقع ہوئی تھی۔

اسلام ایک پیغامِ حیات ہے

میں اسلام کو ایک پیغام حیات سمجھتا ہوں۔ میں اسلام کو زمانہ کے ساتھ چلنے والے نہیں بلکہ زمانہ سے آگے چلنے والا، زمانہ کا رہبر، زمانہ کا رفیق اور شریکِ کارواں ہی نہیں بلکہ اس کا محتسب اور اتالیق (Gaurdian) سمجھتا ہوں۔ اس لیے جب غیر ارادی طریقے پر یا اتفاقاً یا کسی سازش کے ماتحت کوئی اعلیٰ تعلیم یافتہ یہ نتیجہ پیدا کرے کہ اس کی نسل ان تمام اقدار کے بارے میں، ان تمام عقائد و خیالات کے بارے میں شک میں مبتلا ہو جائے اس کا یقین اس سے اٹھ جائے اور وہ ان کو ایک طفل تسلی یا ڈھکوسلا سمجھنے لگے یا کم سے کم اس کو ان اقدار پر اس طرح یقین نہ ہو کہ وہ اس کی حمایت کرے سینہ سپر ہو، ان کے لیے کبھی نبرد آزما ہو جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ تعلیم صرف انتشار کا باعث ہے۔

یہ "تزکیہ" اسلام کا تزکیہ نہیں ہے

عصر حاضر کا چیلنج ہے مادیت، اور اس کا جواب ہے مادیت سے بالاتری، مادیت کی سطح سے بلند ہونا اور یہ ثابت کرنا کہ مادیت ہم کو متاثر نہیں کر سکتی اور ہم مادیت کے غلام نہیں۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم طیبات کو اپنے اوپر حرام کرلیں۔ ﴿قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَ الطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ﴾، ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ﴾۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہہ دیا گیا تو ہم کس شمار میں ہیں۔ ہم مباحات سے پورا فائدہ اٹھائیں۔ ہم اللہ کی نعمتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں۔ اگر ہم لذیذ کھانا کھا سکتے ہیں تو خواہ مخواہ اس کو بے لذت نہ بنائیں جیسے بعض غالی صوفیوں کے متعلق سنا ہے کہ سالن میں پانی اوپر

سے ڈال دیا تاکہ بے مزہ ہو جائے۔ پڑوسیوں میں تقسیم کرنے کے لیے نہیں بلکہ بے لذت بنانے کے لئے، یا بہت سانمک ڈال دیا، یا بے نمک کھارہے ہیں تاکہ کوئی لذت حاصل نہ ہو۔ یہ تزکیہ اسلام کا تزکیہ نہیں ہے۔ شریعت اس کی ہمت افزائی نہیں کرتی۔ آپ کو اگر متوسط درجہ کا خوش ذائقہ کھانا میسر ہے تو ضرور اللہ کا شکر ادا کریں اور ہر ہر لقمہ پر شکر کریں لیکن ہوس ھل من مزید یہ جو آج ہر طبقہ میں آگئی ہے۔ سرمایہ کی کوئی مقدار، عزت کی کوئی مقدار اس کو مطمئن کرنے کے لیے کافی نہیں ہے اور ھل من مزید کا نعرہ بلند ہوتا ہے۔ علماء اس سے بالکل ممتاز متمیز اور نمایاں ہو۔

اسلام کا عقیدہ

واقعہ یہ ہے کہ اسلام کے جوہر اسی وقت کھلتے ہیں جب اس کے ہاتھ میں قیادت ہو اس لیے کہ اسلام کا عقیدہ سروری و جہانبانی کا عقیدہ ہے وہ قیادت کا ایک نظام ہے وہ انسانی قافلے کی سربراہی کرسکتا ہے کسی کا دریوزہ گر نہیں ہو سکتا۔

ثقافیات

ثقافیات

طریقۂ تعلیم

ہم دونوں رفیقوں (علامہ ندوی اور شیخ خلیل عرب کے چھوٹے بھائی) کو دن بھر اس پر محنت کرنی پڑتی تھی۔ پورا سبق تیار کرکے اس طرح ان کے سامنے پیش کرنا ہوتا تھا۔ جیسے آموختہ سنایا جاتا ہے، عبارت کا صحیح پڑھنا، اس کے صرفی و نحوی وجوہ کا جاننا، سوالات کا جواب دینا، عبارت کے مفہوم کو پورے طور پر اخذ کرلینا، یہ سب ہمارے ذمے تھا، دراصل یہی کتاب اور اس کا یہ طریقۂ تعلیم ہماری استعداد اور قوتِ مطالعہ کی کلید تھی، جس سے تعلیم کے ہر ہر مرحلہ میں (جہاں تک زبان کا تعلق ہے) ہر قفل کھلتا چلا گیا۔ دراصل پورے نصاب میں (قدیم نظام تعلیم میں) ایک ہی دو کتابیں ایسی ہوتی تھی جو قوتِ مطالعہ پیدا کر دیتیں اور اخذ مطالعہ کے لیے کافی ہو جاتی تھیں۔

تعلیم کا تجربہ

تعلیم کا یہ تجربہ ہے کہ بعض اوقات ایک ایسا معلم جس کا مطالعہ تو زیادہ وسیع نہیں لیکن وہ اپنے فن و مضمون یا کتاب پر حاوی ہے۔ زیادہ وسیع المطالعہ اور کثیر المعلومات استاد سے زیادہ مفید ثابت ہوتا ہے اور طلباء اس کو ترجیح دیتے ہیں۔

رات گئی بات گئی

اب طریقہ تعلیم بگڑ گیا ہے۔ ملا نظام الدین کا طریقہ درس یہ تھا کہ کتابی خصوصیتوں کا چنداں لحاظ نہیں کرتے تھے۔ بلکہ کتاب کو ایک ذریعہ قرار دے کر اصل فن کی تعلیم دیتے تھے۔ اس طرز

تعلیم نے ملا کمال الدین بحر العلوم حمد اللہ جیسے اہل کمال پیدا کیے تھے۔ اس زمانہ میں جو نصاب رائج ہے درس نظامی کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔

نظامِ تعلیم پر اقبال کی تنقید

نظامِ تعلیم پر اقبال کی تنقید کا ایک رخ یہ ہے کہ وہ نوجوانوں میں مغرب کی اندھی تقلید اور خالص پیروی کا جذبہ پیدا کر دیتا ہے۔ اور ان میں جدت و اجتہاد کا کوئی جذبہ نہیں بیدار کرتا۔ وہ کہتے ہیں کہ دنیا تو خود رسم و رواج میں جکڑی ہوئی ہے لیکن یہ دانش گاہیں اس سے بھی تنگ دائروں میں بند ہیں۔ ان میں جا کر عبقری دماغ بھی امامت عصر کے بجائے ابن الوقتی اور زمانہ سازی کرنے لگتے ہیں۔

مقصد ہو اگر تربیت لعل بدخشاں
بے سود ہے بھٹکے ہوئے خورشید کا پرتو
دنیا ہے روایات کے پھندوں میں گرفتار
کیا مدرسہ کیا مدرسہ والوں کی تگ و دو
کر سکتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت
وہ کہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہے ہیرو

نصاب تعلیم کے مختلف ادوار

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم سہولت کے لحاظ سے نصاب درس کے چار دور قائم کریں، اور جو کتابیں ہر دور میں مروّج تھیں ان کی تفصیل جہاں تک تاریخ سے، مشائخ کے طبقات سے، شعراء کے تذکروں سے اور مکتوبات و ملفوظات سے مل سکتی ہے یکجا کر دیں، دیکھنے کو تو یہ ذرا سا کام ہو گا مگر مختلف کتابوں کے ہزاروں صفحے الٹنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے جو ناظرین کے سامنے

آج پیش کرتے ہیں۔

دورِ اول

اس کا آغاز ساتویں صدی ہجری سے سمجھنا چاہیے اور انجام دسویں صدی پر اس وقت ہوا جب کہ دوسرا دور شروع ہو گیا تھا، کم وبیش دو سو برس تک مندرجہ ذیل فنون کی تحصیل معیار فضیلت سمجھی جاتی تھی، صرف ونحو، بلاغت، فقہ، اصول فقہ، منطق، کلام، تصوف، تفسیر وحدیث۔

اس طبقہ کے علماء کرام کے حالات تلاش کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جیسا ہمارے زمانے میں منطق وفلسفہ معیار فضیلت ہے ویسا ہی اس زمانہ میں فقہ اور اصول فقہ معیار فضیلت تھا۔

دور دوم

نویں صدی ہجری کے آخر میں شیخ عبداللہ اور شیخ عزیز اللہ ملتان سے آئے تھے۔ شیخ عبداللہ دہلی میں اور شیخ عزیز اللہ سنبھل فروکش ہوئے۔ سکندر لودی نے نہایت کشادہ دلی سے ان کا خیر مقدم کیا۔ یہاں تک کہ خود بادشاہ ان کے حلقۂ درس میں آکر شریک ہوتا تھا، اور اس خیال سے کہ اس کے آنے سے سلسلہ درس برہم نہ ہو جائے، مسجد کے کسی گوشہ میں بیٹھ کر ان کی تقریر سے محظوظ ہوتا رہتا تھا، اور بعد فراغت کے شیخ عبداللہ کی خدمت میں جاکر ملاقات کرتا تھا۔

کچھ ان دونوں کے فضل وکمال اور کچھ بادشاہ کی قدردانی سے بہت جلد ان کی علمی شہرت تمام ہندوستان میں پھیل گئی۔ انہوں نے معیار فضیلت کو کسی قدر بلند کرنے کے لیے قاضی عضد کی تصانیف مطالع ومواقف، اور سکاکی کی مفتاح العلوم سلسلۂ درس میں داخل کیں اور بہت جلد یہ کتابیں متداول ہوگئیں۔

اسی دور میں میر سید شریف کے تلامذہ نے شرح مطالع اور شرح مواقف کو رواج دیا، اور

تفتازانی کے شاگردوں نے مطول و مختصر کی بنیاد ڈالی، اور تلویح و شرح عقائد نسفی کو رواج دیا۔

اسی زمانہ میں شرح وقایہ اور شرح ملا جامی بھی رفتہ رفتہ داخل نصاب ہو گئیں۔

اس دور کے سب سے آخری مگر سب سے زیادہ نامور عالم شیخ عبدالحق محدث ہندوستان سے عرب تشریف لے گئے۔ اور تین برس رہ کر علماءِ حرمین محترمین سے حدیث کی تکمیل کی اور اس تحفہ کو اپنے ساتھ لائے اور انہوں نے اور ان کی نامور اولاد نے ہمیشہ ان کی اشاعت کی کوشش کی مگر افسوس ہے کہ اس کو قبولیت حاصل نہیں ہوئی۔ یہ شرف زمانۂ مابعد میں شاہ ولی اللہ کے واسطے رکھا گیا تھا جو ان کو حاصل ہو گیا۔

دور سوم

نصاب درس میں جو تغیر دور دوم میں ہوا تھا، اس سے لوگوں کی امنگیں بڑھ گئی تھی، اور وہ معیار فضیلت کو اس سے بھی زیادہ بلند کرنے کے متمنّی ہو گئے تھے اسی وجہ سے شاہ فتح اللہ شیرازی کے آتے ہی درسگاہوں میں نئی قسم کی چہل پہل نظر آنے لگی۔ دربار اکبری نے ان کو عضدالملک کا خطاب دے کر اپنی قدردانی کا ثبوت دیا اور علماء نے نصاب درس کے اس اضافہ کو فوراً منظور کر لیا جس کو شاہ فتح اللہ شیرازی نے پیش کیا تھا۔

نہایت بے انصافی ہوگی، اگر ہم شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی کو اس موقع پر بھول جائیں، یہ بزرگ محقق دوانی کے بیک واسطہ شاگرد تھے اور سب سے پہلے متاخرین کی تصنیفات کو انہوں نے رواج دیا۔ اس چشمہ فیض سے صرف گجرات ہی سیراب نہیں ہوا بلکہ اس کی چھینٹیں وسط ہند تک پہنچیں۔ قاضی ضیاء الدین نیوتنی کے باشندہ تھے وہ گجرات سے لے کر یہ تحفہ لے کر آئے۔ اور شیخ جمال نے ان سے حاصل کر کے دور دور تک پھیلایا۔ ملا لطف اللہ، شیخ جمال کے ممتاز شاگرد تھے ان سے ملا جیون صاحب نور الانوار، ملا علی اصغر، قاضی علیم اللہ، ملا محمد زمان وغیرہ نے حاصل کیا۔ جن میں کا ہر ایک صاحب سلسلہ اور صاحب درس تھا۔ یہ تو ہوا مگر اس درس کو قبولیت

عام اس وقت حاصل ہوئی جب شاہ فتح اللہ شیرازی نے اس کو رواج دیا اور ان کے شاگرد اور شاگردوں کے شاگرد ہندوستان بھر میں پھیل گئے۔

مفتی عبدالسلام، شاہ فتح اللہ کے جلیل القدر شاگرد تھے۔ انہوں نے چالیس سال تک لاہور میں بیٹھ کر درس دیا، اور ہزاروں کو فائدہ پہنچایا، مگر ہزاروں میں ایک ہی دو ایسے ہوتے ہیں جن کو ناموری اور بقائے دوام کے دربار سے سند ملتی ہے، دیوہ کے مفتی عبدالسلام اور اللہ آباد کے شیخ محب اللہ انہیں خوش نصیبوں میں تھے جو لاہور سے پڑھ کر آئے، اور اپنے لیے سندِ فضیلت علیحدہ قائم کر دی۔ شیخ قطب الدین سہالوی انہیں دونوں کے بیک واسطہ شاگرد ہیں جو ملا نظام الدین بانی درس نظامیہ کے پدر بزرگوار تھے۔

شاہ ولی اللہ المتوفی ۱۱۷۴ھ ہجری اس دور کے سب سے آخر مگر سب سے زیادہ نامور عالم تھے۔ شاہ صاحب عرب گئے اور وہاں کئی برس رہ کر شیخ ابو طاہر مدنی سے فن حدیث کی تکمیل فرمائی۔ اور ہندوستان کو یہ تحفہ لے کر آئے اور ایسی سرگرمی سے اس کی اشاعت فرمائی کہ باوجود کساد بازاری کے اب تک اس کا اثر باقی ہے۔ در حقیقت صحاح ستہ کے درس و تدریس کا ہندوستان میں رواج اسی وقت سے ہوا ہے جب کہ شاہ صاحب اور ان کے نامور اخلاف نے اس کو رواج دیا اور اپنی اپنی عمر عزیز کا بیش بہا حصہ اس کی اشاعت میں صرف کر دیا۔

شاہ صاحب نے اپنی طرز کا ایک جدید نصاب بنایا تھا، مگر چونکہ اس زمانہ میں علم کا مرکز ثقل دہلی سے لکھنؤ منتقل ہو چکا تھا اور تمام درسگاہوں میں منطق و حکمت کی چاشنی سے لوگوں کے کام و زبان آشنا ہو رہے تھے اس نصاب کو قبولیت حاصل نہیں ہوئی۔

دور چہارم

چوتھا دور بارہویں صدی ہجری میں قائم ہوا اور ملا نظام الدین نے ایسے پرزور ہاتھوں سے اس کی بنیاد رکھی کہ اب تک باوجود امتداد زمانہ کے اس میں کا ایک شوشہ بھی کم نہیں کیا گیا۔

قدیم نظامِ تعلیم کی خصوصیات

قدیم نظام تعلیم نقائص اور کمزوریوں سے بالکل مبرا و منزہ نہیں تھا۔ فنی لحاظ سے اس کے متعدّد پہلو قابل تنقید و اصلاح ہیں۔ لیکن جو لوگ اس نظام کے بانی اور ذمہ دار تھے، ان کے مزاج اور اس دینی روح کی بناء پر جو اس کے اندر سرایت کیے ہوئے تھی وہ بعض خصوصیات کا حامل تھا جو اب جدید تعلیمی نظاموں میں مفقود ہیں۔ ان عنوانات کے ماتحت کثیر التعداد مثالیں اور واقعات ہیں جو ہندوستان کی علمی و دینی تاریخ کے ہزار ہا صفحات میں بکھرے ہوئے ہیں ان میں سے صرف چند مثالوں کو انتخاب کر لیا گیا ہے۔

علم ایک اکائی ہے

اگر چہ میں (علامہ ندوی) علم میں تقسیم کا قائل نہیں ہوں...اور میرا عقیدہ ہے کہ علم ایک اکائی ہے جو بٹ نہیں سکتی اس کو قدیم و جدید مشرقی و مغربی نظری اور عملی میں تقسیم کرنا صحیح نہیں ہے اور جیسا کہ علامہ اقبال نے کہا ہے کہ۔

حدیث کم نظراں قصہ قدیم و جدید

میں علم کی دینی و دنیوی تقسیم کا بھی قائل نہیں ہوں۔ میں علم کو ایک صداقت مانتا ہوں، یا ایک انسانی تجربہ جو کسی ملک و قوم کی مِلک نہیں، اور نہ ہونی چاہیے۔ میں زندگی کے دوسرے سرچشموں کی بھی جغرافیائی نسلی تاریخی یا سیاسی حد بندیوں کا قائل نہیں۔ میں علم کو ایک وحدت جانتا ہوں، اور جس کو کثرت کہا جاتا ہے۔ اس کثرت میں بھی مجھے وحدت نظر آتی ہے۔ علم کی وہ وحدت سچائی ہے سچ کی تلاش ہے، علمی ذوق ہے اور اس کو پانے کی خوشی ہے۔

علم کا عشق

جو چیز زیادہ توجہ کے قابل ہے اور اس کو میں (علامہ ندوی) اصل سمجھتا ہوں وہ ہے علم کا

عشق جو ہماری پہلی نسل میں تھا ایک لگن اور خود فراموشی کی کیفیت جو اس عہد میں تصنیفی اور تحقیقی کام کرنے والوں پر طاری رہتی تھی۔

یہ بات کسی خاص دانشگاہ یا جامعہ کو سامنے رکھ کر نہیں کہہ رہا ہوں یہ میرا عام مطالعہ ہے تقریباً سب جگہ یہ محسوس کیا جارہا ہے۔ اور بدقسمتی کی بات ہے کہ علم سے عشق جو ہمارے اسلاف میں پایا جاتا تھا۔ اسلاف سے مراد مسلمانوں ہی کے اسلاف نہیں بلکہ گزشتہ نسل میں پایا جاتا تھا وہ اب بہت کم نظر آتا ہے۔

نصاب تعلیم کے تغیرات

خود آپ کا نصاب تعلیم اس حقیقت کا گواہ ہے کہ علماء اسلام نے کسی ضرورت کے تسلیم کرنے اور کسی مفید و ناگزیر چیز کو قبول کرنے میں کبھی پس و پیش سے کام نہیں لیا، یہ نصاب عہد بہ عہد تبدیلیوں اور مختلف علمی و عقلی رجحانات کا نمائندہ ہے۔ اس میں ہر دور میں اضافہ و ترمیم ہوتی رہی ہے صرف یہ سو برس کا زمانہ ایسا ہے جس میں اس نصاب میں کم سے کم تبدیلی ہوئی ہے حالانکہ یہی زمانہ اپنی سیاسی وذہنی تبدیلیوں کی بناء پر جائز اور ضروری تبدیلیوں کا سب سے زیادہ مستحق اور متقاضی تھا۔

دینی نظام تعلیم و تربیت

ہندوستان نہیں بلکہ پورے عالم اسلام میں صدیوں سے جو نظام تعلیم و تربیت کار فرما تھا۔ اور جس کے حدود گھروں کی چہار دیواری سے لے کر مدارس و جامعات، حلقہائے درس، گوشہ ہائے تصنیف و تالیف، خانقاہوں کی پُر سکون فضاؤں اور سعی وجہد کی متحرک و پر شور درسگاہوں تک وسیع تھے۔ اس کی بنیاد اخلاص وللّٰہیت ایمان واحتساب، اساتذہ وشیوخ کے معاملہ میں کامل اطاعت و انقیاد، مربیوں ومحسنوں کے مسئلہ میں مکمل تفویض و تسلیم، مقاصد زندگی کے بارے میں توکل و قناعت، اعتماد علی اللہ بلکہ ایثار وقربانی، محنت و مطالعہ، اور حصول کمال کے سلسلہ میں استغراق و خود

فراموشی، معاصرین کے ساتھ تعلقات میں تواضع و اعتراف، مختلف الخیال عناصر افراد و جماعتوں کے سلسلہ میں حسن ظن، التماس عذر اور جمع بین الاضداد کی قوت و صلاحیت، کمالات علمی اور مدارج باطنی کے حصول میں علوّ ہمت و مجاہدہ، رفقاء کار و شرکائے حیات کے بارے میں اپنے فرائض کی ادائیگی سے سروکار اور اپنے حقوق کے مطالبہ سے خاموشی پر تھی۔

مدرسیات

مدرسیات

درس میں انہماک

قدیم اساتذہ کو درس و تدریس میں اس وجہ استغراق وانہماک تھا جس کا تصور بھی واقعات اور مثالوں کے بغیر مشکل ہے۔ تعلیم و تعلم ان کی روح کی غذا اور ان کی عبادت اور وظیفہ بن گیا تھا۔ عمر کی طویل سے طویل مدت تک اور دن رات کے زیادہ سے زیادہ اوقات میں درس و تدریس میں منہمک رہتے تھے۔ ملک العلماء ملا وجیہ الدین گجراتی نے ۶۵۔۶۷ سال درس دیا۔ مولانا عبدالسلام لاہوری، ملا عبدالحکیم سیالکوٹی، مولانا علی اصغر قنوجی کی مدتِ درس ۶۰ سال ہے۔ مولانا احمد امیٹھوی عرف ملا جیون نے زندگی کے آخری دن تک درس دیا وقس علی ذلک۔

اساتذہ کے تمام اوقات (بشری ضرورتوں اور قلیل راحت کے علاوہ) درس و تدریس سے گھرے رہتے تھے۔ یہاں تک کہ بعض حضرات کھانے کے وقت اور چلتے پھرتے بھی پڑھاتے تھے۔ ملا عبدالقادر بدیوانی اپنے استاد مولانا عبداللہ بدیوانی کے متعلق لکھتے ہیں کہ ''اپنے گھر کا سودا خود خریدنے بازار جایا کرتے تھے طلبہ کی جماعت ہمراہ ہوتی اور وہ سبق پڑھاتے رہتے تھے''۔

طلبہ سے تعلق

اساتذہ کو اپنے شاگردوں اور طالب علموں سے ایسا گہرا اور شدید تعلق ہوتا تھا جس کی مثال اس زمانہ اور اس نظام تعلیم میں ملنی مشکل ہے۔ اساتذہ طلبہ کو اولاد کی طرح عزیز رکھتے تھے۔ اکثر اوقات ان کی متکفل ہوتے تھے۔ ان کو خورد و نوش میں شریک کرتے تھے۔ عہد اکبری کے شاہی طبیب اور مشہور مدرس حکیم علی گیلانی کے متعلق تذکرہ علمائے ہند کا مصنف لکھتا ہے۔

پیوستہ طلبہ را درس گفتے و بے ایشان طعام نخوردے۔

(ترجمہ) ہمیشہ طلبہ کو درس دیتے اور بغیر ان کے کھانا نہ کھاتے۔

طلبہ کا اساتذہ سے تعلق

طلبہ کا بھی اپنے اساتذہ سے ایسا تعلق تھا جو سعادتمندی روحانی ارتباط اور قلبی وابستگی کی آخری حد ہے۔ اس سلسلہ میں یہ واقعہ تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا کہ ایک مرتبہ استاد العلماء ملا نظام الدین فرنگی محلی کے انتقال کی خبر مشہور ہوگئی، ان کے ایک شاگرد سید ظریف عظیم آبادی کی روتے روتے آنکھیں جاتی رہیں، دوسرے شاگرد سید کمال الدین عظیم آبادی اس صدمہ کی تاب نہ لا سکے اور انتقال کر گئے، بعد میں معلوم ہوا کہ یہ اطلاع غلط تھی۔ اس طرح کا واقعہ اگرچہ نادر الوقوع واقعہ ہے مگر طلبہ کی جاں نثاری و وفاداری اور اپنے اساتذہ کے ساتھ سچے عشق اور لازوال محبت کے واقعات اس قدیم نظام تعلیم کا طرہ امتیاز ہے اور جن علماء نے اپنے اساتذہ کا اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے اس سے ان کے گہرے تعلق اور شیفتگی کا اظہار ہوتا ہے۔

شاہانِ وقت اور رؤساء کی قدر دانی

قدیم تعلیمی عہد کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ سلاطین زمانہ، امرائے نامدار اور رؤساءِ شہر، ان مخلص اساتذہ اور جلیل القدر علماء کی خدمت اور راحت کو اپنی سعادت اور اپنے لیے نجات و فلاح کا وسیلہ سمجھتے تھے۔ ہندوستان کی اسلامی عہد کی تاریخ نے ان سلاطین و امراء کی قدر دانی و قدر شناسی و اعتراف کمال کی کثرت سے مثالیں پیش کی ہیں۔

تاریخ فرشتہ کا مصنف (محمد قاسم بیجاپوری) لکھتا ہے کہ:

"ایک مرتبہ ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی سخت علیل ہوئے (سلطان) ابراہیم شرقی ان کی عیادت کو گیا مزاج پرسی اور ضروری باتوں کی دریافت اور انتظام علاج کے بعد بادشاہ نے ایک پیالہ پانی سے لبریز طلب کیا اور مولانا کے سر پر سے پیالہ کو تصدق کر کے خود پی لیا اور کہا کہ اے خدا جو بلا قاضی صاحب کے لیے مقرر ہے وہ مجھ پر نازل فرما اور ان کو صحت عطا کر۔"

اصلاح باطن اور اہل دل سے تعلق

اس قدیم نظام تعلیم اور اس کے رہنماؤں اور ذمہ داروں کی ایک قابل ذکر خصوصیت یہ تھی کہ ان کو اپنے علمی تبحر، مہارتِ فن کی مرجعیت اور شہرت وعظمت کے اوج کمال پر فائز ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے باطن کی اصلاح، نفس کے تزکیہ، اور نسبت مع اللہ پیدا کرنے کی طرف بھی پوری توجہ تھی۔ وہ جہاں علوم ظاہری کی تحصیل کے لیے کامل الفن اساتذہ اور متبحر علماء کی خدمت اپنا فرض سمجھتے تھے، وہاں اہلِ دل اور اصحاب باطن شیوخ کی کفش برداری اور دریوزہ گری بھی اپنی تکمیل کیلئے ضروری سمجھتے تھے۔ اس میں ان کی شہرت اور مخدومیت قطعاً حارج نہ ہوتی تھی، وہ ایک طرف سلاطین وقت اور امراء و حکام کے سامنے بڑے خود دار و شاہانہ مزاج ثابت ہوتے تھے۔ دوسری طرف ان شاہان بوریہ نشین اور گدایانِ منعم کے سامنے حد درجہ متواضع اور بے نفس نظر آتے تھے "خود شکنی خود نگری" کی یہ نادر اجتماع ان مخلص علماء کی سیرت کا امتیاز ہے۔ ہندوستان کی تعلیمی تاریخ کا یہ پہلو نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہے کہ جن شخصیتوں کو اللہ تعالیٰ نے قبول عام اور بقائے دوام کی دولت سے نوازا اور انہوں نے ہندوستان کے علمی حلقوں پر صدیوں تک کے لیے فرمانروائی کی ہے ان کا اپنے زمانہ کے کسی صاحب دل اور مخلص بزرگ سے ضرور تعلق رہا ہے۔

روایات اسلاف کی امانت دار

ہندوستانی مسلمانوں کی دینی زندگی پر دارالعلوم دیوبند کے فضلاء کی اصلاحی کوششوں کے نمایاں اثرات رونما ہوئے ہیں۔ بدعات ورسوم کی اصلاح عقائد کی درستی تبلیغ دین اور فرقِ ضالہ سے مناظرہ وغیرہ میں ان حضرات کی جدوجہد لائق تحسین ہے۔ متعدد فضلاء نے سیاسی میدان اور وطن عزیز کے دفاع کے سلسلے میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیئے اور حق گوئی و بیباکی میں علمائے سلف کی یاد تازہ کردی۔

تمسّک بالدین، مسلکِ احناف کی سختی سے پابندی اسلاف کی روایات کی حفاظت اور سنت

کی مدافعت دیوبند کا شعار ہے۔

جامعہ کی حقیقی کامیابی

ایک جامعہ کی حقیقی کامیابی یہ ہے کہ وہ سیرت سازی کا کام کرے۔ وہ کریکٹر بنائے، وہ ایسے صاحب علم افراد پیدا کرے جو اپنے ضمیر کا سودا نہ کر سکیں جن کو دنیا کی کوئی طاقت، کوئی تخریبی فلسفہ، کوئی غلط دعوت، کوئی حکومت ان کو کسی دام خرید نہ سکے اور جو یہ کہہ سکیں۔

برو این دام بر مرغِ دگر نہ
کہ عنقا را بلند است آشیانہ

اور اقبال نے کہا۔

دل کی آزادی شہنشاہی، شکم سامانِ موت
فیصلہ تیرا تیرے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم

اے طائرِ لا ہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

دوسرا فرض یہ ہے کہ ہماری جامعات سے ایسے نوجوان نکلیں جو اپنی زندگیاں وقف کردیں، جو قربانی کے لیے تیار ہوں، جن کو کسی کے لیے بھوکے رہنے میں وہ لذت آئے جو پیٹ بھر کر کھانے اور ناؤنوش (Life Enjoy) میں آتی ہے۔ جن کو کھونے میں وہ لذت آئے جو بعض اوقات کسی کو پانے میں نہیں آتی، جو اپنی جوانی کی بہترین توانائیاں اور ذہن کی بہترین صلاحیتیں اور اپنے جامعہ کا بہترین عطیہ جس سے ان کی جھولی بھر دی گئی ہے، ملت کی سربلندی کے لئے، دین کی سربلندی کے لئے، اپنے ملک کو بچانے کے لیے صرف کرے۔ ایک باعزت ملک، باعزت ملت، صاحب پیغام ملت بنانے میں صرف کرے۔ یہ دو چیزیں ہیں ایک تو یہ کہ دل و دماغ کو وہ غذا دی جائے وہ روشنی دی جائے کہ جس سے دل و دماغ دونوں مل کر باہمی تعاون

(Co-operation) کے ساتھ ایک دوسرے کی رفاقت کے ساتھ ان حقائق اور عقائد پر ایمان کو پختہ کریں، اور دوسروں کو سمجھنے، قائل ہونے کا موقع دیں اور انہیں مطمئن کریں۔

یہ ناتمام عمارتیں

یہ مدرسہ جس کو تم حقارت کی نظر سے دیکھتے ہو یہاں کی ناتمام عمارتیں یہاں کی بے سر وسامانیاں اور یہاں کی بہت سی خامیاں اور کھانے کی خرابیاں واللہ العظیم اسی بناء پر ہو سکتا ہے کہ یہاں سے ایسے ایسے لوگ پیدا ہوں جو حق و باطل کے معرکے، کارزار کے لیے شہسوار ہو، اور جانباز ہو اور رسول اللہ ﷺ کے جھنڈے کو پھر سے بلند کریں اور ملحدانہ اور مادہ پرستانہ تحریکوں اور ایمان سوز فتنوں کا جرات کے ساتھ مقابلہ کریں جس کے لیے روح نبوی ﷺ بے چین و مضطرب ہے، اگر ایسی جیتی جاگتی مثال بھی یہاں موجود ہے، اگر ایک دھڑکتا ہوا دل، ایک دیدۂ بینا اور ایک گوش شنوا یہاں حاضر ہے اور ایک متنفس بھی ایسا موجود ہے جس کو اس بات کا احساس ہے کہ یہاں رہ کر یہ کام ہو سکتا ہے جو یہ سمجھتا ہے وہ دن ہماری عمر، ہمارے خاندان اور ہمارے بستی کی زندگی میں بلکہ ہماری اس پوری آبادی کی زندگی میں بڑا مبارک تھا جس دن ہمارے والدین نے ہم کو دارالعلوم۔ کوئی بھی دینی ادارہ۔ بھیجا ان سے ہم کہتے ہیں کہ آج وہ فیصلہ کر کے اٹھیں کہ یہاں۔ مدرسہ۔ وہ اپنے وقت کو صحیح طور سے صرف کریں گے یہاں کے درخت سے وہ بہتر سے بہتر پھل توڑیں گے جس کی توقع کی جا سکتی ہے وہ یہاں کتاب وسنت کا گہرا اور عمیق علم حاصل کریں گے اور وہ زندگی گزاریں گے جو ایک داعی اور عالم ربانی کی زندگی سے مطابقت رکھتی ہے۔

سب سے بڑی کارگاہ

مدرسہ کیا ہے مدرسہ سب سے بڑی کارگاہ ہے جہاں آدم گری اور مردم سازی کا کام ہوتا ہے جہاں دین کے داعی اور اسلام کے سپاہی تیار ہوتے ہیں، مدرسہ عالم اسلام کا بجلی گھر،

(پاور ہاوس) ہے جہاں سے اسلامی آبادی بلکہ انسانی آبادی میں بجلی تقسیم ہوتی ہے۔ مدرسہ وہ کارخانہ ہے جہاں قلب و نگاہ اور ذہن ودماغ ڈھلتے ہیں، مدرسہ وہ مقام ہے جہاں سے پوری کائنات کا احتساب ہوتا ہے اور پوری انسانی زندگی کی نگرانی کی جاتی ہے، جہاں کا فرمان پورے عالم پر نافذ ہے عالم کا فرمان اس پر نافذ نہیں ہے۔ مدرسہ کا تعلق کسی تقویم، کسی تمدن، کسی عہدہ، کسی کلچر زبان و ادب سے نہیں کہ اس کی قدامت کا شبہ اور اس کے زوال کا خطرہ ہو۔ اس کا تعلق براہِ راست نبوت محمدی ﷺ سے ہے جو عالمگیر بھی ہے اور زندہ وجاوید بھی، اس کا تعلق اس انسانیت سے ہے جو ہر دم جواں ہے اس زندگی سے جو ہمہ وقت رواں اور دواں ہے، مدرسہ در حقیقت قدیم و جدید کی بحثوں سے بالا تر ہے وہ تو ایسی جگہ ہے جہاں نبوت محمدی کی ابدیت اور زندگی کا نمو اور حرکت دونوں پائے جاتے ہیں۔

مدرسہ کو چھٹی نہیں

دنیا میں ہر ادارہ ہر مرکز اور ہر فرد کو راحت اور فراغت کا حق ہے اس کو اپنے کام سے چھٹی مل سکتی ہے مگر مدرسہ کو چھٹی نہیں، دنیا میں ہر مسافر کے لیے آرام ہے لیکن اس مسافر کے لیے راحت حرام ہے۔ اگر زندگی میں ٹھہراو ہو سکون اور وقوف ہو تو حرج نہیں کہ مدرسہ بھی چلتے چلتے دم لے لے، لیکن جب زندگی رواں اور دواں ہے تو مدرسہ میں جمود اور تعطل کی گنجائش کہاں ہے۔ اس کو قدم قدم پر زندگی کا جائزہ لینا ہے، بدلتے ہوئے حالات میں احکام دینے ہیں ڈگمگاتے ہوئے پیروں کو جمانا ہے، وہ زندگی سے پیچھے رہ جائے یا تھک کر بیٹھ جائے یا کسی منزل پر قیام کرلے یا اس کو کوئی مقام خوش آجائے تو زندگی کی رفاقت اور قیادت کون کرے، سرودِ ازلی اور پیغامِ محمدی ﷺ اسے کون سنائے۔ مدرسہ کا تعطل، قیادت سے کنارہ کشی، کسی منزل پر قیام خودکشی کا مترادف اور انسانیت کے ساتھ بے وفائی کا ہم معنی ہے۔ اور کوئی خود شناس اور فرض آشنا مدرسہ اس کا تصور نہیں کرسکتا۔

مدارس کا باطنی انحطاط

آپ برا نہ مانیں، کہنے والا بھی آپ ہی میں سے ہے، عرصہ سے ہمارے مدارس ان شاداب پھولوں سے خالی ہوتے جارہے ہیں ان اوصاف میں روز افزوں انحطاط ہے، ہم کو دل پر پتھر رکھ کر سننا چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ کہنے والے نے کہاں تک صحیح کہا ہے کہ ؎

اٹھا میں مدرسہ وخانقاہ سے نمناک
نہ زندگی نہ صحبت نہ معرفت نہ نگاہ

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے مدارس سے جس تعداد میں لوگ فارغ ہو کر نکلتے ہیں کبھی اس تعداد میں نہیں نکلتے تھے لیکن زندگی پر کوئی اثر نہیں ڈال رہے ہیں۔

شخصیات

شخصیات

مشرقِ عربی اور علامہ ندوی

مشرقِ عربی میں رواں دواں اسلامی ثقافت کے قافلہ سے میرا تعلق کبھی منقطع نہیں رہا، میں مستقل اس کی کوشش کرتا رہا کہ اس قافلہ کی ہر کابی سے محروم نہ رہوں، عرب ممالک کے مطابع سے نکلنے والی تمام چیزوں کے حاصل کرنے اور پڑھنے کا میرا شوق، حرص کی حد تک بڑھا ہوا تھا، مصر کے مطابع سے جو چیزیں بھی نکلتی رہیں، اچھی ہوں یا بری، کھری ہوں یا کھوٹی، میری کوشش ہوتی تھی کہ ہر کتاب، ہر تحریر میری نظر سے گزر جائے۔ چنانچہ میں عباس محمود العقاد، ڈاکٹر احمد امین، ڈاکٹر محمد حسین ہیکل، احمد حسن الزیات اور ان سے پہلے مصطفی لطفی المنفلوطی اور رافعی وغیرہ کو پڑھتا رہا تھا، مصر سے شائع ہونے والے دو ممتاز و معروف ہفت روزہ پرچے، الرسالۃ اور الثقافۃ پابندی کے ساتھ پڑھا کرتا تھا۔ یہ دونوں صرف ہفت روزہ رسالے نہیں تھے بلکہ دو ادبی اسکول تھے، دونوں کے نقطہ ہائے نظر الگ اور دونوں کا اپنا اپنا اسلوب تھا۔ اس دور میں مصر کے بیشتر ادباء اور نوجوان اہل قلم انہی دو (۲) اسکولوں میں بٹے ہوئے تھے، اور میں دونوں رسالوں میں لکھنے والے اہل قلم سے واقف تھا۔

علامہ اقبال، علامہ ندوی کی پہلی آئیڈیل شخصیت

پہلی شخصیت جس کے ادب سے راقم کے ذہن وضمیر کو اطمینان وآسودگی ملی، جس سے اعتماد واعتزاز، عالی ہمتی، بلند نظری اور وفورِ جذبات کی نئی خوراک ملتی تھی اور جسے پڑھ کر یہ محسوس ہوتا تھا کہ رگوں میں خون کی رفتار تیز ہوگئی، بدن میں جیسے چیونٹیاں رینگنے لگیں، شعور وافکار میں حرکت پیدا ہوگئی، امیدوں اور آرزوؤں کو نئی زندگی مل گئی، وہ ڈاکٹر محمد اقبال اور ان کا ادب تھا۔

وہ محمد ﷺ کے پیغام کی ابدیت اور ہر دور میں اس پیغام کے حاملین میں قیادت کی صلاحیت پر ایمان رکھتے تھے۔ انہوں نے مغربی تہذیب و تمدن کی عظمت و قوت کو کبھی تسلیم نہیں کیا، بلکہ اس کے بڑے بڑے نمائندوں اور رہنماؤں کو چیلنج کیا۔

عقاد ایک عالی ہمت شخصیت

مجھے (علامہ ندوی) مصر اور دوسرے عرب ممالک کے اہل قلم میں ایسے طاقتور عنصر اور ایسی بلند نگاہی کی تلاش رہتی تھی، اور مصری ادباء و مصنفین میں صرف عقاد کی تحریروں میں اس کی جھلکیاں نظر آتی تھیں، جن میں وہ آزاد اور محقق اور بالغ نظر ناقد نظر آتے تھے۔

سید جمال الدین افغانی

مجھے ایسا لگتا ہے کہ عرب اہل قلم کے اسلوب تحریر اور طرز فکر میں سید جمال الدین افغانی کے اسکول نے بہت اثر ڈالا ہے جب میدان سیاست میں آتے تو استعماری طاقتوں پر جرأت و ہمت کے ساتھ تنقید کرتے اور ان پر سخت حملے کرتے، نہ سزاؤں اور دھمکیوں سے ڈرتے، نہ قید و بند اور ملک بدر ہونے کو خاطر میں لاتے۔

علامہ ندوی ایک عالمگیر شخصیت

راقم سطور (علامہ ندوی) کو اپنی بے بضاعتی اور تہی دامنی کا پورا احساس ہے، لیکن یہ ایک تقدیری بات ہے کہ اس کو ممالک اسلامیہ کی سیاحت، اور عالم اسلامی سے واقفیت کے ایسے ذرائع اور مواقع میسر آئے جو (بلاکسی تحقیر و تنقیص کے) اس کے ہم وطنوں اور ہم عمروں میں سے بہت کم اشخاص کو میسر آئے ہوں گے، دنیائے اسلام اور بالخصوص ممالک عربیہ کے دینی علمی اور روحانی حلقوں کو بہت قریب سے دیکھنے اور پرکھنے کا اتفاق ہوا، دورِ حاضر کی مشکل سے کوئی تحریک اور کوئی عظیم شخصیت ہوگی جس سے ملنے اور سعادت حاصل کرنے کی سعادت حاصل نہ

ہوئی ہو۔

ابوالکلام آزاد ایک نظر میں

بلند و بالا قد و قامت جس کو ”سروآزاد“ کہنا ہر طرح موزوں ہوگا، کتابی چہرہ جس میں سرخی جھلکتی ہوئی آنکھیں، روشن فراخ و متبسم بلکہ متکلّم پیشانی سے خود اعتمادی اور بلند طالعی نمایاں، لباس خالص دہلی و لکھنؤ کے شرفاء بلکہ رؤساء کا سا سادہ، لیکن حسن مذاق و نستعلیقی ہر چیز سے عیاں، ٹوپی ذرا بلند جس میں ان کی انفرادیت جو ان کی ذات کا جوہر بن گئی تھی، نمایاں پاؤں میں سلیم شاہی جوتا، یہ تھے ابوالکلام آزاد جن کو میں نے پہلی بار دیکھا۔

عبدالماجد دریابادی اپنے اسلوب کا بانی

مولانا کے اسلوب تحریر اور ادبی خصوصیات کے متعلق میرا کچھ کہنا تو بے ادبی اور جسارت ہے مگر اتنا ضرور عرض کیا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے طرز کے بانی اور خاتم ہیں، طنز نگاری، اسالیب بیان اور اوصافِ ادب میں نازک ترین اور دشوار ترین صنف ہے، اس میں وہی ادیب، صاحب قلم کامیاب ہوسکتا ہے جو صحیح معنی میں زبان کا اداشناس اور مزاج داں ہو، بلکہ اہل زبان ہو کہ ذرا سی چوک، بے احتیاطی اور بے اعتدالی سے بلکہ بعض اوقات محاوروں کی چاٹ اور زبان کے چٹخارے میں، طنز، ہجو، پھکڑپن اور بے تمیزی کے حدود میں داخل ہوجاتا ہے، حد یہ ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد صاحب جیسا مانا ہوا ادیب، محاورات کے استعمال کے بڑھتے ہوئے شوق میں بعض اوقات موضوع کی ثقافت اور مقصد کی متانت کو قائم نہ رکھ سکا، اور ان مرحوم کو اس کی وجہ دوسروں کا ہدف ملامت اور بلا ضرورت اذیت کا بھی سامنا کرنا پڑا، قرآن مجید کے ترجمہ اور امہات الائمہ کی تعبیر و تحریر میں ان سے ایسی ہی فروگذاشتیں ہوئی، انہوں نے بعض ایسے محاورات کا استعمال کیا جن کے استعمال سے مہذب مجلسوں میں احتیاط برتی جاتی ہے، ذرا سی غفلت بسیار گوئی اور داستاں سرائی کے جوش میں آدمی کو خفت اٹھانی پڑتی ہے۔ ہمارے علم میں

مولانا آزاد جنہوں نے لکھنؤ کے ادبی مجلسوں کا لطف بھی اٹھایا تھا، اور زبان کے نوک پلک سے خوف واقف تھے، اس بارے میں بڑے محتاط تھے، مولانا عبدالماجد کی حس اس بارے میں ذکاوت حس تک پہنچی ہوئی ہے، اور زبان کے معاملے میں ان پر گرفت مشکل ہے بعض مرتبہ ان کا ایک فقرہ ایک شذرہ کا اور ایک شذرہ پوری کتاب کا کام کر جاتا ہے، اور کسی وقت ان کا ایک جملہ مخاطب یا مشار الیہ کے لیے ایسا بھاری پڑ جاتا ہے کہ اس کا رکھنا بھی مشکل ہو جاتا ہے اور اٹھانا بھی بعض مرتبہ وہ کسی پرانے شاعر کے مصرعہ کو عنوان بنا کر پورا کام کر جاتے ہیں، اور وہ مصرعہ سب کچھ کہہ جاتا ہے اس کے بعد جو کچھ ہوتا ہے، سب اس کی تشریح اور تفصیل، اس موقع پر ان کی ادبیات کے ذخیرہ پر وسیع نظر ان کے انتقال ذہنی اور ان کے حسن انتخاب کی بے اختیار داد دینی پڑتی ہے کہ وہ یہ مصرعہ کہاں سے لائے اور کس طرح اس کو نگینہ کی طرح انگوٹھی میں جڑ دیا۔

چار آدمی

میں نے ابھی تک چار آدمیوں کو ہمیشہ صحیح اور فصیح عربی بولتے ہوئے سنا ہے جو اگر لفظ بہ لفظ لکھ لی جائے تو اس میں ذرا تغیر و تبدل ضرورت نہ ہو، کہا جاسکتا ہے کہ وہ اوائل عہد عباسی کی منجھی ہوئی زبان ہے، ایک یہ دونوں ہم نام بہجۃ البیطار اور بہجۃ الاثری تیسرے ہمارے استاد ڈاکٹر تقی الدین الہلالی چوتھے ملک عبداللہ بن حسین سلطنت ہاشمیہ اردنیہ کے بانی۔

علامہ عبدالعزیز میمن

ملک کی تقسیم (ہندوستان) ہوئی تو میں حجاز میں تھا، یہ میرا پہلا سفر حج تھا، مسجد نبوی میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک سوڈانی عالم میرے پاس آئے اور مجھ سے پوچھا کہ پاکستان کا صدر کس کو بنایا گیا؟ میں نے کہا کہ مسٹر جناح کو۔ کہنے لگے کہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ جس ملک میں علامہ عبدالعزیز میمن جیسا یگانہ روزگار فاضل موجود ہو وہاں کسی دوسرے کو صدر بنایا جائے۔ میں نے

ان سے بحث مناسب نہیں سمجھی اور خاموش ہو گیا۔ معلوم نہیں اس لطیفہ کی خبر مولانا کو کیسے پہنچی کہ جب میں جولائی ۷۸ء ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے یہ لطیفہ سنا کر ان کو اور حاضرین کو مسرور و محظوظ کرنا چاہا تو انہوں نے فرمایا کہ مجھے یہ لطیفہ پہنچ چکا ہے۔

علامہ ندوی ایک جری انسان

میں نے تقریر میں بہت صفائی سے کہا کہ ہم ہندوستانی مسلمانوں نے اپنی قسمت اور اپنا دینی مستقبل عربوں کے ساتھ وابستہ نہیں کیا ہے۔ اور ہم ان کے ہر حال میں تابع نہیں ہیں کہ وہ صحیح غلط جو راستہ اختیار کریں، ہم اس پر آنکھ بند کر کے ان کے پیچھے ہولیں، ہماری اسلامیت و دینداری کیلئے ان کی اسلامیت و دین داری شرط نہیں ہے۔ ہمارا معاملہ براہ راست اللہ سے اور اس کے عطا کیے ہوئے دین و شریعت اور اس کے بھیجے ہوئے پیغمبر سے ہے۔

مولانا عبیداللہ سندھی کے دو مایہ ناز شاگرد

مولانا عبید اللہ صاحب سندھی کے ہندوستان میں دو مایہ ناز شاگرد تھے، اور ان کے طرز تعلیم اور مسلک تفسیر کے حامل و امین اور اس میں ان کے صحیح جانشین مولانا احمد علی صاحب لاہوری، اور خواجہ عبدالحیٔ صاحب فاروقی۔

احمد علی لاہوری اور ان کی دو آئیڈیل شخصیات

معاصر علماء اور مشائخ میں سے ان (احمد علی لاہوری) کو دو شخصیتوں سے بے حد عقیدت تھی۔ اور وہ ان کے ساتھ اپنے مشائخ کا سا معاملہ کرتے تھے۔

(۱) ایک مولانا حسین احمد صاحب مدنی

(۲) دوسرے مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری

ان آنکھوں (علامہ ندوی) نے بار بار دیکھا ہے کہ مولانا حضرت رائے پوری کی خدمت میں

حاضر ہوئے اور نہایت ادب کے ساتھ دوزانو اس طرح مراقب ہو کر بیٹھ گئے جیسے کوئی مرید رشید اپنے شیخ کے سامنے حاضر ہوتا ہے۔ اگر حضرت نے کوئی بات پوچھی تو نہایت ادب کے ساتھ مختصر اور بقدر ضرورت جواب دیا ورنہ خاموش رہے۔

بانیٔ جماعتِ تبلیغ مولانا الیاس ایک نظر میں

وہی نحیف جثہ وہی گفتگو میں تکلفات اور انداز خطابت سے بے نیازی، وہی موسوی رنگ کہ زبان سینہ کے جوش اور دل کا ساتھ نہ دے سکے، وہی دعوت کا غلبہ، وہی فکر میں ڈوبا ہوا سکوت، وہی اضطراب سے لبریز تکلم، دعوت کے موضوع کا ضرور فرق تھا۔ لیکن اپنے موضوع سے عشق اور اپنے کام کی فکر کا وہی حال تھا۔ صبح اور شام کی مجلسوں میں شرکت کا اتفاق ہوا۔ ایسے جذب کی کیفیت تھی جس پر عقل وسلوک کے پہرے بیٹھے ہوئے تھے۔

مولانا حیدر حسن خان ٹونکی کی خصوصیات

مولانا (حیدر حسن خان ٹونکی) کی سب سے نمایاں صفت ان کی سادگی اور طلباء کے ساتھ شفقت اور مساوات کی ادا تھی۔ جس کی مثال کم سے کم میں نے علماء و مدرسین میں اپنی آنکھ سے نہیں دیکھی۔ وہ اپنی اولاد اور طلباء میں نہ صرف یہ کہ فرق نہیں کرتے تھے، بلکہ مبالغہ نہ ہوگا اگر کہا جائے کہ ہونہار اور ذہین طلبہ کو اولاد پر ترجیح دیتے تھے، اور میں نے ان کے صاحبزادوں کو خود اس بات کی شہادت دیتے اور اس کا تذکرہ کرتے ہوئے سنا ہے۔ وہ ان سے قطعاً کوئی امتیاز نہیں برتتے تھے۔ اور کسی بات میں ترفع یا خصوصیت پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ ان کے کاموں میں بے تکلف شریک ہوجاتے اور ان کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ بعض اوقات اس میں طلباء کے لیے بڑی آزمائش ہوجاتی تھی۔ لیکن مولانا باصرار اس میں شریک ہوتے تھے۔ کبھی ایسا ہوا کہ ہم لوگ گھاٹ پر کپڑے دھونے گئے، دریا مدرسہ کے سامنے ہی ہے۔ مولانا بھی ساتھ ہوگئے۔ ہم نے عرض کیا کہ آپ کہاں تشریف لے جائیں گے فرمایا جہاں تم لوگ وہاں میں بھی، کوئی میں الگ

ہوں۔ ہم لوگ کپڑے دھونے میں مصروف ہو گئے۔ مولانا ہمارے قریب ہی بیٹھے رہے۔ ایک مرتبہ میں جوتا خریدنے بازار گیا۔ مولانا بھی ساتھ ہو لئے۔ ہر چند عرض کیا نہ مانا، مولانا کو اس سے بھی چڑ تھی کہ کوئی ان کو کمزور یا معمر سمجھ کر کسی محنت کے کام یا جائز تفریح سے روکے۔ ہم لوگ اعظم گڑھ سید صاحب کی عیادت کے لیے گئے ہوئے تھے۔ ایک دن مولانا مسعود علی صاحب نے بندوق اٹھائی اور شکار کے لیے روانہ ہوئے ہم نوجوان اساتذہ دارالعلوم میں ساتھ ہو لئے۔ مولانا بھی ہمارے ساتھ چل کھڑے ہوئے، بہت عرض کیا کہ حضرت آپ کہاں شکار کے لیے چلیں گے۔ فرمایا واہ کیا میں تم لوگوں سے کمزور ہوں، چنانچہ گئے نہ کہیں بیٹھے اور نہ ہمت ہاری۔

خلیل عرب ایک کامیاب مدرس

لیکن ان کی (شیخ خلیل عرب) اصل سند جس سے ہر جگہ انہوں نے عزت پائی، اور اپنے اقران و اماثل میں ممتاز و صدر نشین رہے وہ زبان و ادب کا خداداد ذوق، ان کی تعلیم کا فطری ملکہ، تعلیم میں جانگدازی و دلسوزی کی وہ کیفیت جو مدت دراز سے تعلیمی تدریسی حلقوں سے مفقود، اور تاریخ کے اوراق میں مدفون ہو کر رہ گئی ہے۔ اپنے طلباء و شاگردوں سے پدرانہ بلکہ مادرانہ محبت و انس اپنے ذوق و نظر کو اپنے طلباء تک منتقل کر دینے اور ان کے رگ و ریشہ میں اتار دینے کی عجیب و غریب قابلیت زیر درس کتاب میں جان ڈال دینے فن کا صحیح ذوق پیدا کر دینے اور مصنف کا ہم زبان اور ہم مذاق بنا دینے کی وہ بے نظیر قدرت جو ہزاروں میں سے کہیں کسی ایک استاد و ماہر فن میں ہوتی ہے۔ یہ قابلیت کسبی نہیں، وہبی ہے۔ اللہ تعالیٰ بہت لوگوں سے خصوصی خدمت لینا چاہتا ہے، کسی دور کے نظام تعلیم کے تن مردہ میں وہ زندگی کی نئی روح پھونکتے ہیں انہیں کو وہ تدریسی قوت، اور ذوق آفرینی کی دولت ملتی ہے، ناچیز راقم کو خدا کے فضل سے بڑے بڑے کامل الفن اساتذہ کی خدمت میں زانوئے ادب تہہ کرنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ میرا بال بال رواں رواں ان کے احسانات کا رہین منت ہے۔ لیکن عربی زبان و ادب کے ذوق سلیم و

ذوق صحیح، پھر اس ذوق کو منتقل کرنے کی ایسی قابلیت نہ صرف ہندوستان (جو کہ صدیوں سے عربی کی مذاق سلیم سے ناآشنا اور صحیح طریقہ تعلیم سے محروم ہے) بلکہ ممالک عربیہ کے اعلیٰ علمی وادبی حلقوں میں بھی نہیں پائی۔

شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی

شیخ ہمارے دینی حلقوں میں جس قدر بدنام ہیں، وہ کسی سے مخفی نہیں۔ انگریزوں اور ترکوں نے اور علماء حجاز نے اپنی اپنی مصلحت سے ان کے متعلق جو کچھ مشہور کر دیا، ہمارے علماء نے بلا تحقیق و تفتیش تسلیم کر لیا۔ اور کسی نے براہ راست ان کی تصانیف اور ان کے حالات کے صحیح ماخذ کے مطالعہ کی زحمت گوارا نہیں کی۔ ضرورت تھی کہ کوئی مرد حق شناس ان کے صحیح حالات وخیالات پیش کرتا تاکہ اصل علم وطالبین حق کو صحیح رائے قائم کرنے کا موقع ملتا۔ علماء نجد اور شیخ کے جانشینوں نے متعدد کتابیں لکھیں اور وہ حجاز و مصر میں شائع ہو چکی ہیں۔

شاہ معین الدین ندوی

ہندوستان کی سب سے موقر علمی مجلس (دارالمصنفین) کے وہ (شاہ معین الدین ندوی) صدر نشین، اور موجودہ ہند کے سب سے بڑے مصنف (مولانا سید سلیمان ندوی) کے جانشین تھے۔ وہ زبان وادب، الفاظ و محاورات کے استعمال اور زبان کی صحت وسقم کے بارے میں سند کا درجہ رکھتے تھے، اور اب تھوڑے ہی لوگ زبان کی نوک پلک اور اس کے مزاج سے اتنے واقف ہوں گے، جتنے وہ تھے۔ انہوں نے اودھ کی معیاری مجلسوں، لکھنؤ کی علمی ادبی محبتوں اور اساتذہ فن اور اساطین علم کی آغوش میں آنکھیں کھولی تھیں، اور تربیت پائی تھی۔ ہندوستان کی نہایت باوقار سرکاری اور غیر سرکاری مجلسوں، کمیٹیوں اور اکیڈمیوں کے ممبر تھے "معارف" جیسے رسالہ کے مدیر اور کئی مقبول کتابوں کے مصنف تھے۔ اس سب کے نتیجہ میں اگر ان میں علم کا پندار اور احساس برتری پیدا ہو جاتا تو محل تعجب نہ ہوتا۔ اس کا تقاضا تھا کہ وہ ضروری

موقعوں پر بھی اپنے تاثرات کو چھپاتے اور چھوٹوں کی داد و تحسین میں بہت زیادہ محتاط رہتے۔ لیکن ان کی طبعی شرافت، محبت کے فطری عنصر اور تواضع و سادگی جو ان کی جبلت بن گئی تھی، ان کو اس سے باز رکھتی اور وہ اپنے خورد سال و نیاز مند معاصرین اور اہل قلم کو دل کھول کر داد دیتے ان کی یہ تحریر ہی ان کی شرافت نفس کا آئینہ ہیں، اور اس کے بغیر ان کی سیرت اور اصل جوہر کا سمجھنا مشکل ہے۔

شاہ عبدالعزیز ایک معتدل مزاج شخصیت

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کی (اپنے تمام ظاہری و باطنی کمالات کے ساتھ) سب سے نمایاں صفت ان کی غیر معمولی جامعیت اور ان کی طبیعت کا اعتدال اور سلامت روی ہے۔ وہ ایک طرف معقول و منقول پر یکساں طور پر حاوی تھے۔ تفسیر و حدیث وفقہ کے مانے ہوئے امام اور استاد الکل تھے۔ دوسری طرف عربی کے نہایت بلند پایہ ادیب و شاعر، فارسی کے نثار، شعر و شاعری کے مسلم الثبوت نقاد اور اداشناس کہ دہلی کے نامی گرامی شعراء ان سے مشورہ سخن کرتے، اور کھرا کھوٹا پہچانتے، خطاطی، علم موسیقی، تاریخ و محاضرات کے اور علم مجلسی، اسی طرح سے علم کلام و مناظرہ اور حاضر جوابی میں بے نظیر اور ان تمام طبقوں اور حلقوں کے مرجع و ماوی تھے۔ ان کمالات علمی و علمی کے ساتھ طبیعت میں اتنا اعتدال اور سلامت روی تھی کہ ہر طبقہ کے لوگ ان کا ادب و احترام اور ان کے فضل و کمال کا اعتراف کرتے تھے، اور متنازع فیہ مسائل میں انہیں کے طرف رجوع کرتے۔

جامع الکمالات

مولانا عبدالحیٔ صاحب (والد گرامی علامہ ابوالحسن علی ندوی) کی علمی و تصنیفی زندگی میں جو تنوع اور جامعیت اور مزاج میں جو اعتدال و میانہ روی نظر آتی ہے، وہ اس نسبت عالی کا ایک پرتو ہے، ایک طرف وہ علوم معقول و منقول کے جامع محدث اور فقیہ، دوسری طرف مؤرخ و

ادیب اور نقاد و سخن شناس ہیں۔ ایک طرف وہ معقولات کی بلند پایہ کتاب شمس بازغہ کا درس کامیابی و مہارت کے ساتھ دیتے ہیں، دوسری طرف صحاح ستہ کو ایک صاحب فن کی حیثیت سے پڑھتے پڑھاتے ہیں، ایک طرف ان کے قلم سے حدیث میں تلخیص الاخبار اور اس کی شرح منتہی الافکار نکلتی ہے تو دوسری طرف تراجم و تاریخ میں نزہۃ الخواطر اور الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند اور اس کے ساتھ اردو شعر و شاعری کی تاریخ میں تذکرہ گل رعنا جیسی کتابوں کے مصنف ہیں۔ نیز طبیعت افراط و تفریط سے دور جامع اور معتدل، عقائد و اصول میں ایک طرف استحکام و تصلب، دوسری طرف فروغ و جزئیات میں وہ توسع و تحمل تھا، جو ان کی تمام تحریروں اور ان کے طرز زندگی سے عیاں ہے۔ اس کا نتیجہ تھا کہ وہ اہل سنت کے تمام مختلف الخیال علمی و دینی حلقوں اور مکاتب فکر میں یکساں طور پر احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں، اور اسی بناء پر وہ تراجم و تاریخ کی پر خار وادی کو کامیابی کے ساتھ طے کر سکے۔ اور ندوۃ العلماء کی ہمہ گیر تحریک کی قیادت کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہو سکے جس کا تعلق علماء کے مختلف حلقوں اور جماعتوں اور اہل سنت کے مختلف فرقوں سے رہا ہے۔

بنو ہاشم

قریش کے قبیلہ میں بنو ہاشم کی حیثیت ایک ایک گلِ سر سبز کی تھی، تاریخ کی کتابوں میں ان کے بارے میں اگرچہ مختصر اور ناکافی مواد ملتا ہے۔ لیکن جو کچھ ملتا ہے اسی کو سامنے رکھا جائے تو اس سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ قریش کی یہ شاخ اپنے انسانی شعور اور اعتدال پسندی میں امتیاز رکھتی تھی۔ دینی و دماغی طور پر بھی اس کو کسی قدر فوقیت حاصل تھی۔ بیت اللہ (خانہ کعبہ) کا اللہ تعالیٰ کے یہاں جو مقام و مرتبہ تھا، اس پر پختہ ایمان رکھتی تھی، ظلم و زیادتی کو گناہ سمجھنے کا شعور ختم نہیں ہوا تھا "ہٹ دھرمی" اور ضد اس کا شعار نہیں تھا، ہمت بلند تھی، کمزوروں اور ضعیفوں پر رحم و شفقت کا برتاؤ کرتی سخاوت و شجاعت اس کا مزاج تھا۔ غرض اخلاق و شرافت، سیر چشمی،

حمیت اور جوشِ عمل کی وہ خصوصیات جن کے لیے عربی میں ایک جامع لفظ ''فروسیت'' کا ہے، بنی ہاشم میں بدرجہ اتم موجود تھی۔ ان کے اخلاق و سیرت، رسول اکرم ﷺ کے آباؤ اجداد کے شایانِ شان تھے اور اسلام نے جن اخلاق عالیہ کی دعوت دی ہے ان سے ان کے اخلاق مناسبت رکھتے تھے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ایک زمانہ تک وہ اپنی قوم و ہم وطن قبائل کے عقائد جاہلیت اور غیر اللہ کی عبادت میں ان کے شریک ہو گئے تھے۔

ابوطالب کا نام

ابوطالب بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبد مناف کی پیدائش رسول اللہ ﷺ کی ولادت باسعادت سے پینتیس (۳۵) سال پہلے ہوئی۔ مشہور روایت یہ ہے کہ ان کا نام عبد مناف تھا مگر وہ اپنی کنیت سے مشہور ہوئے۔ ایک روایت یہ ہے کہ ان کا نام عمران تھا کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ان کا نام شیبہ تھا۔

چار بزرگ

ہشام الکلبی نے اپنی سند سے حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت کی ہے کہ قریش میں چار بزرگ ایسے تھے جن کو لوگ اپنے معاملات میں ثالث اور قاضی بنایا کرتے تھے، وہ چار یہ تھے: (۱) عقیل (۲) مخرمہ (۳) حویطب (۴) ابوجہم۔

حدیث قرطاس اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ

حدیث قرطاس کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے استاد عباس محمود العقاد نے لکھا ہے

''یہ کہنا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی وہ تھے جو نبی علیہ السلام کی وصیت کے نفاذ میں حائل ہو گئے، اور آپ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلیفہ معین کرنے سے روک دیا انتہائی رکیک اور بے وزن بات ہے۔ کسی بھی قابل ذکر شخص کی طرف ایسی بات منسوب کرنا اس کی اہانت ہے۔ چہ

جائیکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسی شخصیت کی طرف اور جس نے اس سے اتفاق کیا ہو، حقیقت میں نبی علیہ السلام نے کاغذ اس لیے نہیں طلب فرمایا تھا کہ علی رضی اللہ عنہ یا کسی اور کے خلیفہ بنانے کی وصیت فرمائیں۔ کیونکہ خلافت کی وصیت لکھنے کی ضرورت نہ تھی، ایک لفظ تھا۔ ایک اشارہ بھی بہت تھا، جیسے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو جب نماز کے لیے بڑھایا تو اشارہ کر دیا اور سبھوں نے سمجھ لیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا منشاء ہے۔

طلب قرطاس کے بعد تین (۳) روز تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حیات رہے، مگر دوبارہ کاغذ نہیں مانگا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کوئی حائل نہ تھا۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی زوجہ محترمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آپ کی روح پرواز کرنے کے وقت تک موجود تھیں۔ اگر آپ چاہتے تو حضرت کو بلوا کر اپنا جانشین نامزد فرما دیتے۔

قطع نظر اس سکوت سے جس کے پیچھے کوئی جبر یا زور نہ تھا، کسی امر کی ولایت یا سربراہی سپرد کرنے کے سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہمیشہ سے یہ طرز عمل رہا ہے کہ اپنے افراد خاندان کو ولایت سے علیحدہ رکھتے اور انبیاء پر وراثت کے قانون کو جاری کرنا صحیح نہ سمجھتے۔ آپ کا یہ طریقۂ عمل اور یہ سکوت دونوں کو ملا کر دیکھئے تو پتہ نہیں چلتا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنانے کا ارادہ فرمایا تھا اور آپ کے ارادہ کو صاف صاف بتانے میں کوئی حائل ہو گیا۔

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بیعت

اس سلسلہ میں مختلف روایتیں ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کی بیعت کب کی حافظ ابوبکر البیہقی اپنی سند کے واسطہ سے حضرت ابوسعید خدری سے روایت کرتے ہیں کہ:

> ''حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ منبر پر چڑھے اور لوگوں پر نظر دوڑائی ان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نہیں پایا تو ان کو بلا کر کہا اے رسول اللہ کے عم زاد بھائی اور آپ کے داماد! کیا

آپ پسند کرتے ہیں کہ مسلمانوں کا اتحاد پارہ پارہ ہو جائے؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا مجھے کوئی شکایت یا رنجش نہیں اے خلیفہ رسول اللہ! یہ کہہ کر آپ نے بیعت کرلی۔ یہی الفاظ تھے یا اس کا مفہوم یہی ہے۔

اس واقعہ کا ایک اہم اور قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ:

”حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پہلے ہی دن بیعت کرلی ہے یا وفات کے دوسرے روز اور یہی حقیقت امر ہے کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کسی وقت حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا ساتھ نہیں چھوڑا اور کسی نماز میں بھی غیر حاضر نہیں رہے“۔

مشہور ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ضروری سمجھا کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے احساسات و جذبات کا کسی درجہ لحاظ کریں اس لیے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت نہیں کی، پھر جب فاطمہ رضی اللہ عنہ چھ (۶) ماہ بعد انتقال کر گئیں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے برسرعام بیعت کی۔ ابن کثیر اور دوسرے اہل علم کا رجحان اس طرف ہے کہ یہ دوسری بیعت پہلی بیعت کی توثیق و تجدید تھی۔ اس سلسلہ میں صحیحین اور ان کے علاوہ دوسری کتابوں میں متعدّد روایتیں ہیں۔

حضرت ابو بکر، ڈاکٹر فلپ ہٹی کی نظر میں

ڈاکٹر فلپ ہٹی اپنی مشہور کتاب مختصر تاریخ عرب میں لکھتا ہے

”ابو بکر مرتدین کو مغلوب کرنے والے اور جزیرۃ العرب کو اسلام کے جھنڈہ کے نیچے متحد کرنے والے ایک سیدھی سادی زندگی گزارتے تھے۔ جو متانت و وقار سے بھری ہوئی تھی۔ وہ اپنی خلافت کی مختصر مدت کے پہلے چھ (۶) مہینے میں روزانہ اپنی قیام گاہ ’سنح“ سے (جہاں وہ اپنے مختصر خاندان کے ساتھ ایک معمولی سے مکان میں رہتے تھے) صبح اپنے دارالحکومت مدینہ کی طرف آتے تھے وہ حکومت سے کوئی تنخواہ نہیں لیتے تھے۔ اس لیے کہ اس وقت حکومت کی کوئی آمدنی نہیں تھی۔ جو قابل ذکر

ہو وہ حکومت کے تمام کام مسجد نبوی کے صحن میں بیٹھ کر انجام دیتے تھے۔''

حضرت عمر، ممتاز قانون دان شیعہ صاحبِ قلم سید امیر علی کی نظر میں

ممتاز شیعہ قانون دان اور انگریزی کے نامور صاحب قلم جسٹس سید امیر علی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

''حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا مختصر عہد خلافت صحرا نشین عرب قبائل میں امن و امان قائم رکھنے میں صرف ہو گیا۔ ان کو نئی اسلامی سلطنت کی تنظیم کا موقع نہیں ملا۔ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ جو واقعی ایک عظیم انسان تھے انہوں نے جب خلافت کی زمام کار اپنے ہاتھوں میں لی تو اس بات کی انتھک اور کامیاب کوشش کی کہ مفتوحہ ممالک میں عوام کو زندگی کی سہولتیں حاصل ہوں اور بہبودی کا دور دورہ ہو، یہ ایک اہم خصوصیت ہے جو اسلامی حکومت کو ابتداء ہی سے حاصل رہی۔''

موصوف ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں

''حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت بڑی اہمیت کی حامل اور اسلام کے لیے بڑی قوت بخش تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اخلاقی لحاظ سے ایک صاحب کردار انسان تھے۔ مزاج میں پختگی اور فطرت میں نرمی تھی۔ عدل و انصاف کے معاملہ میں ٹھوس اور اصول پسند تھے۔ سیرت کی پختگی اور قوتِ عمل میں بے نظیر تھے''۔

وہ باہم شیر و شکر تھے

حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب بیت المقدس کے سفر پر گئے تو اپنی جگہ پر قائم مقام حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی کو بنا گئے تھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی صاحبزادی ام کلثوم کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زوجیت میں دیدیا۔ اور یہ دلیل ہے کہ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی کتنی عزت دل میں رکھتے تھے اور ان کا آپس میں کس

درجہ ارتباط تھا۔

عظیم لوگ عظیم محبت

حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وفات پر رو رہے تھے ان سے پوچھا گیا کہ کیوں رو رہے ہیں تو فرمایا عمر کی موت پر رو رہا ہوں۔ عمر کی موت اسلام میں ایک ایسا شگاف ہے جو قیامت تک پُر نہیں کیا جاسکے گا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا زندہ وجاوید کارنامہ

سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کا سب سے عظیم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے پورے عالمِ اسلام کو ایک مصحف اور ایک ہی قرأت (باعتبار حروف وترتیب آیات وسور) پر متفق کردیا۔ مصحف کے متعدّد نسخے لکھوا کر تیار کرنا اور تمام اسلامی ملکوں کے دارالحکومت میں ایک ایک سرکاری نسخہ بھیج دینا اور ایک قرأت کو طے کردینا حضرت عثمان کی خلافت کا اہم ترین کارنامہ ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کب ہوئی؟

اس امر میں مؤرخین کا اختلاف ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کا واقعہ کس روز پیش آیا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ذی الحجہ کی انیسویں تاریخ تھی ان کے الفاظ میں ذی الحجہ کی اٹھارہ (۱۸) راتیں گزر چکی تھیں، اور یہی بات عام طور پر مشہور ہے۔ دوسرے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ واقعہ ایام تشریق میں پیش آیا۔ اس کو ابن جریر نے روایت کیا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے جمعہ کا دن تھا اور ذی الحجہ کے (۳) تین روز گزر چکے تھے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ عین قربانی کے دن (۱۰) ذی الحجہ کو یہ حادثہ پیش آیا جیسا کہ ابن عساکر نے لکھا ہے۔ (البدایۃ والنھایۃ ج ۷ ص ۱۹۰)

انتظامی صلاحیتوں میں ممتاز

حضرت معاویہ اپنے طبقہ میں اور اپنی نسل کے لوگوں میں تنظیمی و انتظامی صلاحیتوں میں ممتاز تھے۔ ان کے اندر شخصی اخلاق و مدارات اور سیاسی حکمتِ عملی اور حاکمانہ رکھ رکھاؤ دونوں تھے وہ عوام کو حاکمانہ رعب و داب اور فیاضانہ داد و دہش دونوں سے کام لے کر مطمئن رکھتے تھے اور حالات و مواقع کے مطابق کام کا اسلوب جانتے تھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سیرت ایک نظر میں

اپنی ذات کے معاملے میں انتہائی محتاط تھے۔ اپنے منصب اور خاندانی برتری کا مطلقا استحصال نہیں کرتے تھے۔ اگر بازار سے کوئی چیز خریدنا ہوتا تو دوکانداروں اور بیچنے والوں میں سے ایسے دوکاندار یا بائع کو تلاش کرتے جو آپ کو پہچانتا نہ ہو، اور اسی سے سودا خریدتے۔ اس کو سخت ناپسند کرتے کوئی تاجر آپ کے ساتھ اس لیے رعایت کرے کہ آپ امیر المومنین ہیں۔ اس بات کی پوری کوشش کرتے کہ لوگوں کے درمیان اپنے قول وعمل اور برتاؤ میں اور اپنی مجلسوں میں مساوات قائم رکھیں، اور اپنے کارندوں اور عالموں سے اس طرح کا مطالبہ کرتے اور علاقوں کو حاکموں سے بھی اسی کی توقع رکھتے ان حکام کی سخت نگرانی کرتے اور کبھی کبھی اچانک معائنہ کرنے والوں کو بھیجتے کہ وہ جا کر دیکھیں کہ حکام کا عوام کے ساتھ کیا سلوک ہے۔ اور عوام کی ان حکام کے بارے میں کیا رائے ہے؟ آپ کے مقرر کردہ کارندوں اور حکام پر آپ کی ہیبت تھی، اور اگر ضرورت پڑتی تو مجبوراً فہمائش اور عتاب سے بھی کام لیتے آپ کے وہ مکاتیب جو ان حکام اور کارندوں کے نام ہیں اس طرز عمل کے شاہد ہیں۔

امیر معاویہؓ

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم لکھتے ہیں:

''امیر معاویہ کی حکومت شخصی تھی، وہ اس کے استحکام اور بقاء کے لیے ہر ممکن تدبیر و طریقہ اختیار کرتے تھے لیکن کسی حالت میں ان کا قدم دنیاوی حکمرانی کے نقطۂ نظر سے جائز حدود سے باہر نہیں نکلا، وہ بڑے متحمل مزاج تھے ان کا حلم تاریخی مسلمات میں ہے۔ ان کے مخالفین بھی ان کے تحمل اور برداشت کے معترف تھے۔ مشہور شیعی مؤرخ ابن طقطقی لکھتا ہے ''معاویہ کے حلم کے موقع پر حلم اور سختی کے موقع پر سختی سے کام لیتے تھے لیکن حلم کا پہلو غالب تھا ان کے حلم کے بہت سے واقعات الفخری اور طبری وغیرہ سے نقل کیے ہیں، وہ جب تک سختی کے لیے مجبور نہ ہو جاتے تھے اس وقت تک سختی سے کام نہ لیتے تھے اس بارے میں ان کا اصول یہ تھا جہاں سے میرا کوڑا کام دیتا ہے وہاں تلوار کام میں نہیں لاتا، اور جہاں زبان کام دیتی ہے وہاں کوڑا کام میں نہیں لاتا۔ اگر میرے اور لوگوں کے درمیان بال برابر بھی رشتہ قائم ہو تو میں اس کو نہیں توڑ دیتا، جب لوگ اس کو کھینچتے ہیں تو ڈھیل دیتا ہوں اور جب وہ ڈھیل دیتے ہیں تو میں کھینچ لیتا ہوں''۔

یزید، احمد بن حنبل کی نظر میں

امام احمد بن حنبل کے صاحبزادہ صالح بن احمد کہتے ہیں:

''میں نے والد سے پوچھا کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ان کو یزید سے محبت ہے تو فرمایا میرے بیٹے! کیا کوئی شخص جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے وہ یزید کو پسند کر سکتا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ والد محترم پھر آپ اس پر لعنت کیوں نہیں کرتے؟ امام احمد بن حنبل نے کہا بیٹے! تم نے کب اپنے باپ کو دیکھا ہے کسی پر لعنت کرتے ہوئے؟''

امام ابن تیمیہ نے فرمایا:

’’جس نے بھی حسین کو شہید کیا ان کے قتل میں مدد کی یا ان سے راضی ہوا، اس پر اللہ کی، فرشتوں کی، اور تمام لوگوں کی لعنت، اللہ تعالیٰ نہ ان کے عذاب کو دور کرے گا اور نہ اس کا عوض قبول کرے گا‘‘۔

علامہ اقبال کا عقیدہ و ایمان

یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال کا یہ عقیدہ و ایمان تھا کہ ایک مسلمان ہوا کے رخ پر نہیں چلتا، بلکہ وہ اس لیے پیدا کیا گیا ہے کہ بہتے ہوئے دھارے کا رخ پھیر دے۔ عالم کو اپنی راہ پر چلائے، تہذیب و تمدن اور معاشرہ اور سماج کا رخ پھیر دے، اور ساری انسانیت اس کے عمل و ارادہ کے تابع ہو جائے اس لیے کہ وہ اپنے پاس اس دکھی انسانیت کے لیے ایک زندہ پیام رکھتا ہے۔ جو اس کے تمام دکھوں کا مداوا ہے، اس کے پاس ایمان و یقین کی جیتی جاگتی طاقت ہے۔ اس عالم کی رہنمائی کا وہی ذمہ دار ہے۔ دنیا کی امامت و قیادت اسی کو زیب دیتی ہے، اس عالم میں وہ صاحب امر و نہی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر زمانہ اسے قبول نہ کرے، سماج اس کا مخالف ہو، اور سیدھی راہوں سے ہٹا ہوا ہو، تو پھر اس کے لیے یہ کسی طرح صحیح نہیں ہے کہ وہ زمانے کے آگے ہتھیار ڈال دے اور اپنے آپ کو غلط سماج کے سپرد کر دے، بلکہ اس پر ضروری ہے کہ زمانے کے خلاف علم بغاوت بلند کرے اور معاشرہ اور سماج سے جنگ کرے۔ یہاں تک کہ کامیابی و کامرانی اس کے قدموں پر آ لگے۔ اقبال کے نزدیک ’’چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی‘‘ کا نظریہ زندگی ایک مرد مؤمن کے لیے کسی طرح صحیح نہیں۔ وہ کہتا ہے:

حدیث کم نظراں ہے تو با زمانہ بساز
زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز

حضرت رسولِ اکرم ﷺ کے رفیق و حواری

گزشتہ قوموں کا بھی یہی عقیدہ تھا کہ ان کے انبیاء علیہم السلام کے حواری اور رفقاء مخلوق خدا میں سب سے بہترین لوگ ہیں۔ یہ قومیں اپنے پیغمبروں کے حواریوں اور رفیقوں کی محبت و عقیدت میں معروف و مشہور تھیں، اس لیے ہمیں صحابہ کرام سے اور زیادہ محبت و عقیدت ہونی چاہیے جو اس نبی کے رفیق و حواری ہیں۔ جس نے اس دنیا پر سب سے زیادہ گہرا، لافانی اثر ڈالا ہے۔

مسلمان مبلغین ہندوستان میں

اس عظیم ملک (ہندوستان) میں مسلمان کبھی تو ہر قسم کے دنیاوی مفاد اور مادی منفعت سے بے نیاز ہو کر خالص دینی جذبات کے تحت داخل ہوئے وہ یہاں اسلامی عدل و انصاف کا پیغام لے آئے تاکہ تنگ و تاریک دنیا میں روشنی و کشادگی کے لیے ترسی ہوئی انسانیت کو خدا کی وسیع زمین میں فطرت کے انمول خزانوں سے بہرہ ور ہونے کا طریقہ سکھلائیں، اور غلامی و محکومی کی آہنی زنجیروں سے جکڑے ہوئے بے بس انسانوں کو خالق کائنات کی بخشی ہوئی آزادی سے مستفید ہونے کا موقع دلائیں، اسلام کے بے لوث خادموں اور شاہان بوریہ نشین کی زندگیاں، ان مخلص مبلغوں کی بہترین مثال ہے۔ جن کے سایۂ عاطفت میں ہندوستانی معاشرہ کے ستائے ہوئے ہزاروں مظلوموں کو نہ صرف پناہ ملی بلکہ وہ ان کے یہاں حقیقی باپ بیٹوں اور بھائی بہنوں کی طرح رہنے لگے۔ حضرت سید علی ہجویری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ، خواجہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور سید علی بن شہاب ہمدانی کشمیری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا شمار انہیں بزرگوں میں ہوتا ہے۔

فاتحین و بانیان حکومت

کبھی مسلمان اس ملک میں (ہند) فاتح سپہ سالاروں اور بلند ہمت سلاطین کی حیثیت سے آئے۔ جیسے سلطان محمود غزنوی، شہاب الدین محمد غوری اور ظہیر الدین بابر تیموری۔ ان سلاطین کے ہاتھوں اس ملک میں ایسی عظیم الشان حکومت کی بنیاد پڑی، جس نے عرصہ دراز تک اس ملک کی خدمت کی اور اسے ترقی و خوشحالی کی بلند ترین منزل تک پہنچا دیا۔

صوفیائے کرام اور اشاعتِ علم

ہندوستان کے صوفیائے کرام ہمیشہ علم کے سرپرست اور پشت پناہ رہے ان میں سے اکثر وبیشتر اعلیٰ علمی ادبی ذوق رکھتے تھے، اور ان کا روز اول سے یہ عقیدہ تھا۔

که بے علم نتواں خدارا شناخت

اور یہ کہ جاہل صوفی بازیچہ شیطان ہوتا ہے اسی بناء پر انہوں نے بڑے بڑے عالی استعداد طالبین کو اس وقت تک اجازت نہیں دی جب تک کہ انہوں نے اپنی علمی تکمیل نہیں کر لی۔ ہندوستان کی تعلیمی تحریک اور یہاں کی علمی چھل پہل بالواسطہ اور بلا واسطہ مشائخ طریقت کی سرپرستی و ہمت افزائی کا نتیجہ ہے۔ آٹھویں صدی میں ہندوستان کے دو زبردست عالم اور جہاں استاد قاضی عبدالمقتدر کندی اور شیخ احمد تھانیسری، حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی سے وابستہ تھے۔ گیارہویں صدی کے بعد مشہور مدرس مولانا لطف اللہ کوروی جن کے تلامذہ اور شاگردوں کے شاگردوں سے درس و تدریس کا ہنگامہ تیرہویں صدی تک گرم رہا۔ ایک چشتی شیخ طریقت تھے بیشتر دوروں میں خانقاہ و مدرسہ لازم و ملزوم رہے۔ جون پور کی خانقاہ رشیدیہ، ٹیلے والی مسجد لکھنؤ میں مولانا پیر محمد صاحب کا مدرسہ، دہلی میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی درسگاہ، اور گنگوہ میں مولانا رشید احمد صاحب کی خانقاہ اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

بعض شخصیتیں

بعض شخصیتیں ذہن میں ایسی رچی بسی ہوتی ہیں، اور ان سے ملنا ان کا دیکھنا سننا زندگی کا ایسا معمول بن جاتا ہے کہ یہ پتہ لگانا بہت مشکل ہو جاتا ہے کہ پہلی مرتبہ ان کو کب اور کہاں دیکھا تھا؟ اس کا معاملہ کچھ ایسا ہی ہوتا ہے جیسا اپنے گاؤں اور محلہ کا یا وہاں کے رہنے والوں کا کہ شعور کے ساتھ ہی ان کی جان پہچان اور ان کی دید و شنید شروع ہو جاتی ہے۔

کتابیات

کتابیات

سید قطب کی ایک لاجواب تصنیف لطیف

مکہ مکرمہ میں جب مجھے یہ کتاب ''العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام'' تحفہ میں ملی تو یہ (خاص طور سے جدید عربی کتب خانہ میں) میرے لیے ایک غیر متوقع چیز تھی، مجھے ایسا لگا جیسے میری کوئی عزیز اور کھوئی ہوئی چیز واپس مل گئی، یا میں نے کوئی نیا انکشاف کیا۔ اس کتاب کا مصنف اس معذرت خواہانہ اسلوب سے آزاد تھا جسے ایک مدت سے مسلمان اہل قلم نے اپنا شعار بنا رکھا تھا، اس نے دفاع کے بجائے حملہ کا انداز اختیار کیا تھا، اور مغربی افکار کے بارے میں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اور ان آزادی ناقدین کی سطح سے گفتگو کی تھی جن پر کسی سماج، ثقافت، سیاست یا مصلحت کا دباؤ نہ ہو جن کی بحث و تحقیق کی غرض و غایت صرف حقیقت کی تلاش ہو، اور جنہوں نے مغربی تہذیب و تمدن کو کتابوں میں نہ پڑھا ہو، بلکہ اس میں زندگی گزار کر اور اس کو پرکھ کر دیکھا ہو، مسیحیت اور یونانی و رومی تمدنوں کا وسیع و عمیق مطالعہ کیا ہو، جدید اقتصادی اور اجتماعی فلسفوں اور نظریات کو جانچا اور پرکھا ہو اور مغربی تہذیب اور اس کے طویل تجربات کی تحلیل اور تجزیہ کر سکتا ہو۔

اس کتاب میں میرے لیے سب سے زیادہ مؤثر اور جاذب قلب و نظر جو چیز تھی وہ مصنف کا اپنے دین کی صلاحیت اس کی برتری اور اس کی ابدیت پر ایمان، اور یہ کہ یہی ایک ایسا پیغام ہے، جس میں نوع انسانی کی سعادت و کامرانی کی ضمانت ہے۔ اگرچہ اس کتاب میں بعض ایسی باتیں ملی جن میں مصنف سے اتفاق نہیں کر سکا، اور دل میں خیال آیا کہ کاش کتاب ان قابل گرفت چیزوں سے خالی ہوتی یا فاضل مصنف نے ان باتوں کی تلاش و تحقیق پر مزید توجہ دی ہوتی اور ان برگزیدہ شخصیتوں کے بارے میں احتیاط سے قلم اٹھایا ہوتا، جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول

ﷺ کی صحبت کا شرف عطا کیا تھا اور غلطیوں سے پاک ذات صرف اللہ کی ہے۔

واقدی کی فتوح الشام

کتاب کیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ معرکۂ جہاد برپا ہے، تلواریں چمک رہی ہیں، مجاہدین ہتھیلی پر سر رکھے ہوئے لڑ رہے ہیں، اور راہ خدا میں جان دے اور لے رہے ہیں۔ کتاب کی تاثیر کا یہ عالم ہے کہ پڑھنے والے کی آواز گلوگیر اور آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہے اور سننے والوں سر وپا کا ہوش نہیں رہتا۔

سیرۃ النبی پر شاہکار کتابیں

میں نے اپنی ساری عمر میں سیرت نبوی میں رحمۃ للعالمین ﷺ اور النبی الخاتم سے زیادہ مؤثر کتاب نہیں پڑھی، کتاب پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف علم وانشاء پردازی کی کرشمہ سازی نہیں ہے۔ اس کے اندر ان کا سوز دروں اور خون جگر بھی شامل ہے اور واقعہ یہی ہے کہ۔

رنگ ہو یا خشت و سنگ چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزہ فن کی ہے خون جگر سے نمود

خلیل عرب کی محبوب کتاب

ابن المقفع کی مشہور کتاب کلیہ ودمنہ شروع کرادی، جو ان کی بڑی محبوب کتاب تھی، اور جس کے اسلوب اور زبان کے وہ بڑے قائل تھے یہ ان کے دو خانہ ساز نصاب کی بڑی معرکۃ الآرا کتاب تھی، وہ اس کو بڑی محنت وذوق سے پڑھا کرتے تھے۔

نزہۃ الخواطر وسیع تذکرہ

نزہۃ الخواطر اس لحاظ سے اس وقت تک سب سے بڑا جامع اور وسیع تذکرہ ہے جو

ہندوستان کے مصنف کے قلم سے نکلا ہے۔ اولاً وہ کسی خاص طبقہ اور صنف کے ساتھ مخصوص نہیں، اس میں علماء و مشائخ، سلاطین و امراء، شعراء و ادباء اور ہر صنف و فن کے اہل کمال دوش بہ دوش اور پہلو بہ پہلو نظر آتے ہیں۔ ثانیاً اس کا تعلق کسی خاص تاریخی عہد اور صدی سے نہیں، بلکہ مسلمانوں کے داخلہ ہند سے اپنے عہد (چودھویں صدی ہجری) تک کے اعیان و مشاہیرہ کا تذکرہ ہے۔ ثالثاً اس کا تعلق کسی خاص خطہ ملک وولایت یا علاقہ سے نہیں بلکہ درہ خیبر سے لے کر خلیج بنگال اور بحیرہ عرب کے ساحل تک اس کا دامن پھیلا ہوا ہے۔

وفیات الاعیان اور نزہۃ الخواطر

حضرۃ الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی نے ایک مرتبہ مجھ (علامہ ندوی) سے دریافت کیا کہ جانتے ہو کہ ابن خلکان کی کیا خصوصیت جس کی وجہ سے اس کی وفیات الاعیان کو علماء نے ہر زمانہ میں حرز جان بنایا ہے؟ راقم (علامہ ندوی) نے اپنے محدود علم و مطالعہ کی بناء پر کچھ عرض کیا فرمایا کہ ابن خلکان کی اصل خصوصیت یہ ہے کہ وہ جس کا ترجمہ لکھتا ہے اس کے اصل موضوع اور امتیازی علم کا تعین ابتدائی تعارفی عبارت ہی میں کرا دیتا ہے مثلاً فلان النحوی'' ''فلان الجدلی'' ''الفقیہ'' پھر جتنا غور و مطالعہ کیا جائے اس کو اس جگہ سے ہٹانا مشکل ہو جاتا ہے اس کے بعد فرمایا کہ یہی خصوصیت مولانا سید عبدالحئی صاحب کی نزہۃ الخواطر میں ہے۔

نہج البلاغۃ

''نہج البلاغہ'' جس کو الشریف الرضی (۳۵۹-۴۰۴ھ) نے جمع کیا ہے۔ یہ وہ مجموعہ ہے جس میں امیر المومنین کے خطبات، مکتوبات و رسائل اور حکیمانہ اقوال و امثال جمع کیے گئے ہیں، اس کے بارہ میں تاریخ ادب عربی کے ایک مشہور مؤرخ و ناقد کی رائے لکھی جاتی ہے۔

استاد احمد حسن الزیات لکھتے ہیں:

''کچھ لوگوں کا رجحان اس طرف ہے کہ اس مجموعہ کا بڑا حصہ الشریف الرضی کی

تصنیف ہے کیونکہ اس میں صحابہ کرام پر طنز و تعریف ہے اور ان کے حق میں نامناسب الفاظ آگئے ہیں، اور اس لیے بھی کہ اس میں فلسفۂ اخلاق اور علم الاجتماع کی ایسی باتیں بھی ہیں جو بعد کی پیداوار ہیں اور بہت باریکی کے ساتھ کس چیز کا وصف اور صنائع و بدائع کا تکلف پایا جاتا ہے جو اس زمانہ کی چیز نہیں تھی، اور وہ اس زمانہ کے لوگوں کے مزاج سے مناسبت نہیں رکھتا ظاہر ہے کہ اس مجموعہ میں بہت کچھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا کلام ہے اور زیادہ حصہ ان سے منسوب کیا گیا ہے۔"

فردوسی کا شاہنامہ

ایران کی عظمت رفتہ کو لافانی بنانے، اور فارسی زبان وادب کو زندگی و تابندگی عطا کرنے اور قومی شعور کی بیداری میں شہرۂ آفاق شاعر فردوسی (م ۴۱۱ھ) کے "شاہنامہ" کا بڑا حصہ رہا ہے، ہر زمانہ میں ایرانی شاہنامہ کے وارفتہ و شیدائی رہے، ایرانی حکومت نے فردوسی کی شاندار، یادگار قائم کر کے اس کو زبردست خراج تحسین پیش کیا ہے۔

نادر تصنیفات

عربی زبان کے علاوہ اسلامیات و ادبیات پر فارسی اور اردو میں علمائے ہند کے قلم سے بعض ایسی نادر تصنیفات نکلی ہیں جو اپنے موضوع پر اپنی بعض خصوصیات کے لحاظ سے بالکل منفرد ہیں اور کسی دوسرے اسلامی ملک میں ان کی نظیر نہیں پائی جاتی، مثلاً علوم و معارف ددینیہ میں مجدد الف ثانی، حضرت شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوبات، مخدوم شیخ یحییٰ منیری کے مکتوبات سہ صدی، مسئلہ خلافت پر حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی ازالۃ الخفاء، اصول التفسیر میں ان کی الفوز الکبیر، رد شیعیت میں شاہ عبدالعزیز صاحب کا تحفہ اثنا عشریہ، تصوف و تزکیہ میں حضرت سید احمد شہید کی صراط مستقیم، اسلام میں منصب امامت اور ائمہ و نائبین رسول کے صفات و فرائض کے موضوع پر مولانا شاہ اسمٰعیل شہید دہلوی کی منصب امامت، مولانا محمد قاسم

نانوتوی کی حجۃ الاسلام اور تقریر دلپذیر وغیرہ۔ مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی لکھنوی کی بعض کتابیں رد شیعیت اور تفسیر آیات میں، سیرت نبوی پر مولانا سید سلیمان ندوی کی ''سیرۃ النبی ﷺ'' اور خطبات مدراس'' اور قاضی محمد سلیمان منصور پوری کی سیرۃ رحمۃ للعالمین، مولانا سید مناظر احسن گیلانی کی النبی الخاتم، فارسی شاعری پر مولانا شبلی کی شعرالعجم بے نظیر تصنیفات ہیں اور ان میں سے متعدد کتابوں کا ترجمہ عربی فارسی اور ترکی میں ہو چکا ہے۔

اداریات

اداریات

دارالعلوم دیوبند

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی وجہاد کی (جس کی قیادت ہندوستان کے دینی عنصر اور علماء نے کی تھی) ناکامی پر خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں میں تیزی کے ساتھ احساس شکست، احساس کمتری اور ایک عام مایوسی پھیلی جا رہی تھی۔ انگریز حکومت (جو مذہباً عیسائی تھی) کی خلاف توقع کامیابی سے عیسائی مشینریوں اور پادریوں کے حوصلے بہت بلند ہو گئے تھے اور انہوں نے صاف صاف کہنا شروع کیا تھا کہ یہ ملک (ہندوستان) عیسیٰ مسیحؑ کا عطیہ اور امانت ہے کہ اس میں مذہب مسیحی کی پورے طور پر اشاعت کی جائے۔ مسلمانوں میں جدید مغربی نظام تعلیم اور فلسفہ زندگی و تمدن سے دینی و اخلاقی انتشار اور اپنے مذہب سے ناواقفیت کی لہر پھیلتی جا رہی تھی۔ اور صاف نظر آ رہا تھا کہ آئندہ نسل اپنے اخلاقی نظام اور اسلامی تہذیب و شریعت سے بیگانہ ہو گی۔ اس صورتحال کے مقابلہ میں جری و دور بیں علماء نے اسلام کے دینی و علمی سرمایہ کی حفاظت اور مسلمانوں کے دینی تعلق و احساس کو باقی رکھنے کے لیے ایسے دینی مدارس کا قیام ضروری سمجھا جو سیاسی زوال کے بعد مسلمانوں کو دینی و اخلاقی زوال سے محفوظ رکھیں، اور ان میں ایسے علماء تیار ہو کر نکلیں جو اسلامی شریعت و فقہ سے گہری واقفیت رکھتے ہوں، اور ان میں داعیانہ روح اور رضاکارانہ خدمت و اشاعت علم کا جذبہ ہو، اور جو حکومت کی اعانت و سرپرستی کے بغیر اس ملک میں مسلمانوں کی دینی خدمت اور رہنمائی اور علم کی اشاعت و حفاظت کا فرض انجام دے سکیں۔ ان مدارس میں دارالعلوم دیوبند کو اولیت اور خاص اہمیت حاصل ہے۔

یہ ادارہ ایک چھوٹے سے مدرسہ کی حیثیت سے جس کی کوئی اہمیت نہ تھی قائم ہوا لیکن اس کے ذمہ داروں اور مدرسہ کے اساتذہ کے اخلاص و قناعت اور ایثار کی بدولت برابر ترقی کرتا رہا۔

یہاں تک کہ اس کی حیثیت ایک بڑی اسلامی یونیورسٹی بلکہ برِاعظم ایشیا کی سب سے بڑی دینی درسگاہ کی ہوگئی۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

مولانا محمد علی نے جن کو عیسائی مشینریوں سے مناظرہ کرنے کا اکثر اتفاق ہوا تھا، اور جو ایک تبلیغی و مناظرانہ رسالہ ''تحفہ محمدیہ'' نکالتے تھے اور ایک حساس اور مطالعہ کرنے والا دماغ رکھتے تھے۔ یہ محسوس کیا کہ یورپ کے اثرات کا مقابلہ کرنے کے لیے اور نئے طرز کے داعی اور مذہب کے ترجمان پیدا کرنے کے لیے قدیم طریقہ تعلیم، قدیم علم کلام اور قدیم نصاب کافی اور مفید نہیں، اس کے لیے ایک جامع اور اصلاح شدہ نصاب تعلیم ضروری ہے جس میں دور از کار، قدیم نظری علوم میں ترمیم واختصار اور جدید مفید علم کا اضافہ ہو۔

یہ وہ دور تھا کہ مسلمانوں کے مختلف فقہی گروہوں (حنفی شافعی اہل حدیث) میں مناظرہ کا بازار گرم تھا۔ جس کے نتیجہ میں فسادات، طویل مقدمہ بازی اور مسلمانوں کی ہوا خیزی ہو رہی تھی۔ انہوں نے محسوس کیا کہ جب تک علماء و فضلاء مدارس میں رواداری، وسعت قلب اور جزئیات و فقہی مسائل میں توسیع پیدا نہ ہو اس صورت حال کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ انھیں دو مقاصد اصلاح نصاب اور رفع نزاع باہمی کے لیے انہوں نے اولاً ۱۳۱۰ھ میں ندوۃ العلماء کے نام سے ایک انجمن قائم کی۔ پھر ایک نمونہ کی درسگاہ کی ضرورت محسوس کر کے ۱۳۱۲ھ میں اودھ کے علمی و تہذیبی مرکز لکھنؤ میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کی بنیاد رکھی۔

رفتہ رفتہ ہندوستان کے اکثر اصلاح پسند اور درد مند علماء و عمائد جدید سر بر آوردہ تعلیم یافتہ حضرات اور ملت کے مختلف مکاتب خیال کے موقر نمائندوں نے اس کی دعوت کو قبول کیا، اور اس کی مجلس انتظامی میں بحیثیت رکن یا اس کے دائرِ عمل میں بحیثیت کارکن شریک ہوئے۔ ان میں مولانا شبلی نعمانی، مولانا حبیب الرحمن خان شروانی، مولانا عبدالحق حقانی، مولانا شاہ سلیمان

پھلواروی، منشی اطہر علی کاکوروی، مولانا محمد ابراہیم آروی، قاضی محمد سلیمان منصور پوری، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا سر رحیم بخش، مولانا مسیح الزمان خان (استاد میر محبوب علی خان نظام دکن) مولانا خلیل الرحمن سہارن پوری (فرزند مولانا احمد علی صاحب محدث) مولانا حکیم سید عبدالحئی، نواب سید علی حسن خان (فرزند نواب صدیق حسن خان والی بھوپال) مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء دینی مدارس کی اس ذہنیت سے کہ قدیم تعلیمی ڈگر سے ذرا سا ہٹنا بھی ایک طرح کی تحریف اور بدعت ہے۔ اور یونیورسٹیوں کی جدت نوازی سے (جس کے تحت ہر قدیم چیز حقیر اور ہر جدید نظریہ وقیع اور قابل احترام ہے) سے بے نیاز ہو کر نقطہ اعتدال پر قائم ہوا۔ اس کے بانی قدیم و جدید کے افراط و تفریط، علماء کی علیحدگی پسندی کے رجحانات اور فقہی تنازعات کو مسلمانوں اور اسلام دونوں کے لیے ہلاکت خیز سمجھتے تھے۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء کی بنیاد قدیم و جدید کے امتزاج اور اعتدال و توسط کے اصول پر رکھی گئی۔ ذمہ داران ندوۃ العلماء کا خیال تھا کہ دین ایک ایسی ابدی اور محکم چیز ہے جس میں کسی تغیر و تبدل کا امکان نہیں۔ لیکن علم ایک تغیر پذیر شے ہے جس میں ضرورت اور وقت کے تقاضوں کے لحاظ سے تبدیلی اور حذف و اضافہ ہو سکتا ہے۔ دارالعلوم کا مقصد اصلی اہلسنت کے مختلف فرقوں کے درمیان (جو عقائد و ارکان دین میں متفق ہیں) اتحاد و یکجہتی پیدا کرنا تھا، شروع ہی سے ندوۃ العلماء نے علوم اسلامیہ اور نصاب درس کو تغیر پذیر اور حسب ضرورت ترمیم و تنسیخ کے لائق سمجھا۔

دارالعلوم نے خاص طور سے قرآن مجید کے طرف ایک ابدی پیغام حیات کی حیثیت سے توجہ کی۔ عربی زبان و ادب کی تعلیم کی طرف بھی ایک زندہ اور جدید زبان کی حیثیت سے توجہ منعطف کی۔ کیونکہ عربی زبان ہی قرآن و سنت کے فہم کی کلید اور اس کے رازہائے بستہ کی امین ہے۔ دارالعلوم نے کبھی عربی زبان کو قدیم اور مردہ زبان (جس کے بولنے اور لکھنے والے اس دنیا میں ناپید ہوں) نہیں سمجھا جب کہ ہندوستان نے اس زبان کے ساتھ یہی سلوک کر رکھا تھا۔

نصاب درس میں ندوہ نے ان قدیم علوم کو جو زیادہ مفید نہیں تھے، حذف کر دیا یا ان کی مقدار بہت ہی کم کر دی اور ان کی جگہ ایسے جدید علوم داخل درس کیے جن کی موجودہ دور کے عالمِ دین کو جو ملتِ اسلامیہ کی خدمت کرنا چاہتا ہو، شدید ضرورت پیش آتی ہے۔

دارالعلوم نے اس بات کی پوری کوشش کی کہ اسلام کے ایسے داعی و شارح تیار کیے جائیں جو دین حنیف کو جدید دنیا کے سامنے مؤثر انداز اور جدید اسلوب میں پیش کر سکیں۔ ندوہ کو بحمد اللہ اپنے مقاصد میں قابل قدر کامیابی حاصل ہوئی، اور تھوڑے ہی عرصہ میں ایسے علماء تیار ہوئے جو جدید دنیائے اسلام کیلئے قابل تقلید ہیں۔ ان فضلاء نے اسلامی ادب، علم سلام تاریخ اور سیرت نبوی کے موضوع پر نہایت قیمتی لٹریچر فراہم کر دیا۔

دارالمصنفین اعظم گڑھ

مولانا شبلی نعمانی نے اعظم گڑھ میں ۱۹۱۴ء میں ایک وقیع تصنیفی علمی اکیڈمی دارالمصنفین قائم کی، اور اس کے لیے اپنا ذاتی باغ اور بنگلہ وقف کیا۔ ان کی وفات کے بعد اس علمی مجلس کو ربع صدی سے زیادہ مدت تک مولانا سید سلیمان ندوی کی نگرانی اور رہنمائی کا شرف حاصل رہا۔ مجلس کے رفقاء نے مذہب، تاریخ اور ادب کے مختلف شعبوں میں کتابیں تالیف کیں جن کی مجموعی تعداد ۱۹۶۰ء تک نوے تک پہنچ چکی ہے۔ اور جن سے ہندوستان کا کوئی کتب خانہ مستغنی نہیں رہ سکتا۔ مشہور علمی اور ادبی ماہنامہ ''معارف'' بھی دارالمصنفین ہی سے نکلتا ہے جس کے مدیر مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی ناظم دارالمصنفین ہیں۔

ندوۃ المصنفین دہلی

دہلی میں ایک اور اہم علمی انجمن ''ندوۃ المصنفین'' ہے، جس کا قیام ۱۹۳۸ء میں عمل میں آیا۔ اور جس نے اب تک ۱۹۶۰ء تاریخی اور ثقافتی موضوعات پر ۸۸ کتابیں شائع کیں۔ جو ملک کے علمی و دینی حلقوں میں مقبول ہوئیں۔ مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی ایم اے کی ادارت

میں ایک علمی ماہنامہ ''برہان'' بھی یہاں سے نکلتا ہے۔

مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ

لکھنؤ میں مجلس تحقیقات و نشریات اسلام کے نام سے حال میں ایک علمی و تصنیفی ادارہ قائم ہوا ہے، جس نے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں اسلام کے مقاصد اور تعلیمات کے تعارف کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ اس نے تھوڑے عرصہ میں کئی وقیع کتابیں شائع کی ہیں۔

دائرۃ المعارف حیدرآباد

ہندوستان کے عظیم علمی اداروں میں دائرۃ المعارف حیدرآباد کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ جس نے بکثرت بیش قیمت اور اہم علمی و دینی کتابوں کو قدیم ترین کتب خانوں سے نکال کر شائع کرنے کی ذمہ داری لی۔ ''دائرۃ المعارف'' کا قیام ۱۸۸۸ء میں عماد الملک سید حسین بلگرامی، ملا عبدالقیوم اور فضیلت جنگ مولانا انوار اللہ خان استاد میر عثمان علی خان سابق نظام حیدرآباد کی تحریک پر عمل میں آیا۔ دائرہ نے اب تک حدیث اسماء الرجال، ریاضیات اور فلسفہ کی ڈیڑھ سو سے زائد ایسی قیمتی و نادر کتابیں شائع کیں جن کو عالم اسلام اور ہندوستان کے علمی حلقے عرصہ دراز سے فراموش کر چکے تھے۔ بڑے بڑے علماء اور اہل درس اور تحقیقی کام کرنے والے فضلاء ان کا نام سنتے تھے۔ دائرہ کی بدولت یہ کتابیں پہلی مرتبہ منظر عام پر آئیں اور علماء و محققین نے ان سے فائدہ اٹھایا۔ دائرہ کی یہ خدمات علمی و دینی اعتبار سے بڑی اہمیت کی حامل ہیں اور وہ ہندوستانی مسلمانوں کا ایک روشن اور لازوال علمی کارنامہ اور ان کے اعلیٰ علمی ذوق اور دینی خدمت کا ثبوت ہے۔

اس عظیم ادارہ کی جلیل القدر خدمات کا اعتراف مشرق و مغرب کے ممتاز علماء و محققین نے بھی کیا ہے۔ ۱۹۳۷ء میں جامعہ ازہر کے علماء کا ایک وفد ہندوستان کے دورہ پر آیا تھا۔ وفد کے قائد مشہور مصری عالم شیخ ابراہیم الجابی نے دائرۃ المعاف کے بارے میں ان الفاظ سے اظہار خیال

کیا

''ہم دائرۃ المعارف حیدرآباد کے ذمہ داروں کی اس کامیاب جدوجہد کو بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جو وہ علم و ثقافت اسلامیہ کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں کر رہے ہیں۔
متقدمین علماء محققین کی قیمتی کتابیں جو عرصہ دراز سے پردہ خفاء میں تھیں، اور جن کے نشانات تک مٹ چکے تھے، لیکن کانوں میں ان کے نام گونج رہے تھے، مدت سے ذہن و دماغ ان سے استفادہ کے لیے ترس رہے تھے۔ دائرہ کے عالی ہمت کارکنوں نے ان کتابوں کو نا صرف ڈھونڈ نکالا، بلکہ تصحیح و مقابلہ اور مفید اضافوں کے ساتھ انہیں شائع کیا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے نہ تو اخراجات کی پرواہ کی اور نہ کتابوں کے حصول کے لیے دور دراز کے سفروں میں انہیں جو دشواریاں اٹھانی پڑیں اور نقل و تصحیح و مقابلہ میں جو دماغ سوزی انہیں کرنی پڑی اس کا انہوں نے کچھ خیال کیا۔

ادبیّات

جانے کے بعد اسی شعبہ میں اس کی انفرادیت یا برتری تسلیم کی جاتی ہے اور وہی اُس کے قبول عام اور بقائے دوام کا سبب بن جاتا ہے۔

خاکہ نگاری کی اولین شرط

خاکہ نگاری کا بڑا وصف اور اولین شرط میرے نزدیک یہ ہے کہ وہ معمولی کو غیر معمولی بنا دے، بڑے کو کتنا ہی بڑا دکھائے آسان ہو گا، بنسبت اس کے کہ چھوٹے کو بڑا دکھایا جائے فن اور فنکار کی یہ معراج ہوگی۔

مشرقی ادب و تاریخ

ہمارے مشرقی ادب و تاریخ کی ایک خامی یہ ہے کہ شخصیتوں کے چہروں پر عقیدت و تقدس کے ایسے دبیز پردے پڑ گئے ہیں اور ان کے خارق عادت کمالات کو اتنے شغف و انہماک کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ ان کی اصلی خط و خال اور ان کے بشریت کے مظاہر ان کی عادات و خصوصیات اور ان کی بے تکلف مجلسوں کی اصل تصویر دب کر رہ گئی ہے۔ اکثر ان کتابوں کے پڑھنے سے انسان کو ان کا لطف محبت اور ان کے مزاج و مذاق سے واقفیت حاصل نہیں ہوتی۔ عام طور پر ایک ہی طرح کے الفاظ اور ایک ہی طرح کے احوال و کرامات دہرائے جاتے رہتے ہیں۔ یہ عیب عربی تاریخوں میں کم اور فارسی تاریخوں اور تذکروں میں زیادہ ہے۔

تاریخ وادب

ادب تخیل پسند ہوتا ہے اور تاریخ حقیقت پسند، ادب اپنی پرواز کے لیے آزاد اور بے قید فضا چاہتا ہے، تاریخ اپنے سفر کے لیے ایک محدود اور نپا تلا راستہ، ادب تشبیہ و استعارہ اور تخیل سے آب و رنگ پیدا کرتا ہے اور تاریخ حوالوں، واقعات اور قدیم تحریروں کی پابندی سے گرانبار

ہوتی ہے۔

علم وادب کی ترقی

علم وادب کی ترقی ہر زبان وادب اور ہر ملک وملت میں ان سب لوگوں کی رہین منت ہے جنھوں نے اس کے خرمن میں ایک دانے کا بھی اضافہ کیا۔ یا اس کے گیسو سنوارنے یا گرد وغبار اور خس وخاشاک دور کرنے میں ہاتھ کا بھی اشارہ کیا۔ خود مغربی ممالک کی ادب وزبان اور فن تنقید کی تاریخ تشکر وممنونیت اور اقرار واعتراف کے ان شریفانہ نمونوں سے لبریز ہے۔ جس کی تقلید وپیروی ہمارے مشرقی ممالک کے لیے معراج کمال اور ہمارے ادیبوں اور ناقدروں کے لیے سدرۃ المنتہیٰ بنی ہوئی ہے۔

ملک اور زبان وادب

ایک حقیقت تو یہ ہے کہ کسی ملک میں دین کی خدمت واشاعت اور وہاں کی زندگی پر اثر انداز ہونے کے لیے ضروری ہے کہ دین کی خدمت کرنے والوں کو اس ملک کی زبان وادب کا صاف ستھرا ذوق ہو اور وہ مذاق سلیم اور معیار صحیح کے مطابق اس میں اظہار خیال کرنے کی قدرت جیتی جاگتی زبان اور شگفتہ انداز بیان میں تصنیف تالیف کی قابلیت رکھتے ہوں دین کی دعوت اس وقت بہت موثر ہو جاتی ہے جب اس میں دل آویزی اور دلپذیری بھی ہو اور یہ بھی ایک ایسی نفسیاتی حقیقت اور امر واقعہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام تک کو اپنی قوم کو خطاب کرنے اور ان کے دل و دماغ میں نفوذ کرنے کے لیے بہترین زبان دی گئی قرآن مجید میں کہا گیا ﴿إِنَّآ أَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ﴾، کہیں فرمایا گیا ﴿بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ﴾، کہیں ارشاد ہوا: ﴿وَمَآ أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ﴾ اہل فکر سمجھتے ہیں کہ لسان القوم سے مراد صرف اتنا ہی نہیں کہ وہ ان کو سمجھ سکتا اور ان کو سمجھا سکتا ہو بلکہ اپنے زمانے کے اعلی سے اعلی لسانی اور ادبی معیار پر پورا اترتا بلکہ سب سے

فائق ہو اس کی تصدیق اس سے ہوتی ہے کہ اس کے بعد ہی فرمایا ﴿لِتُبَيِّنَ لَهُمْ﴾۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: أنا أفصح العرب۔

ندویّات

ندویّات

قائد کی دو صفات

پہلی صفت اپنی دعوت و تحریک سے غیر معمولی شغف اور اس پر کامل اطمینان و انشراح، اور اس کے لیے پوری فنائیت اور اپنی ساری صلاحیتوں اور توانائیوں، وسائل اور طاقتوں کیساتھ اس میں ہمہ تن مشغول رہنا، ان داعیوں اور قائدین کیلئے جن سے اللہ تعالیٰ کوئی بڑا کام لیتا ہے اور عمومی فائدہ پہنچاتا ہے یہ اہم اور بنیادی شرط ہے۔

دوسری صفت ان کی، دوسری اہم خصوصیت وصفت تربیت و مردم سازی ہے۔

ذرائع معاش

مادّی ترقی اور مادی اقدار کی اہمیت و تقدیس کی مسلسل اور پرجوش تبلیغ و تلقین نے خود اس امت کو متاثر کر لیا ہے جن کی ساری طاقت اور جس کی فتح کا راز ایمان بالغیب کی قوت، رضائے الٰہی کی طلب اور جنت کے شوق میں مضمر تھا، مسلمان نے ذرائع معاش کو اپنا رزاق سمجھ لیا ہے۔

تعریف پر مبالغہ آرائی

ہمارے (علامہ ندوی) ملک میں قومی و ملی تحریکات کے شروع ہونے، جماعت سازی، اور خطابت و صحافت کے اس دور میں (جو تحریک خلافت اور جنگ آزادی کے بعد بڑے پیمانہ پر شروع ہوا) اعزاز و اکرام، اور تعریف و توصیف کے خطابات و القابات دینے کا عام رواج ہو گیا، اور بعض مرتبہ اس میں ایسی فیاضی، غلو اور مبالغہ اور عجلت و جذباتیت سے کام لیا گیا کہ بعض حقیقت پسندوں کی زبان پر بے اختیار یہ مصرعہ آگیا ع

اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

اپنوں کی مخالفت

سب جانتے ہیں کہ اپنے خاندان کے افراد کی مخالفت اپنے گھر میں ایذا و اہانت کا معاملہ سماجی مقاطعہ باہر کی مخالفتوں اور قید و بند کی صعوبتوں سے کہیں زیادہ صبر آزما اور اذیت رساں ہوتا ہے۔

باہمہ و بے ہمہ شخصیت

جب ملت میں انتشار ہو، مختلف جماعتیں اور مکاتب خیال کسی نہ کسی درجہ میں عصبیت سے متاثر ہوں تو ایسی مرنجاں مرنج عالم و برباد اور باہمہ بے ہمہ شخصیت کی ضرورت شدت سے محسوس کی جاتی ہے۔

انسان کی بڑی خصوصیت

انسان کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے خلاف سننے کی صلاحیت رکھتا ہو، اور سخت سے سخت بات برداشت کرے۔

صرف ذہانت کافی نہیں

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ علم اور اعتقاد دونوں میں رسوخ پیدا کرنے کے لیے تنہا ذہانت کافی نہیں، بلکہ بسا اوقات ذہانت وبالِ جان بن جاتی ہے، اس کے لیے وسعتِ مطالعہ بھی کافی نہیں، اس لیے بنیادی بات یہ ہے کہ اساتذہ فن سے آدمی کو ان علوم کی تعلیم حاصل کرنے اور بڑھنے کا موقعہ ملے، اگر یہ موقعہ ہاتھ سے نکل جاتا ہے تو کوئی چیز اس کی تلافی نہیں کر سکتی۔ یہ عجیب المیہ ہے کہ بہت سے ذہین ہی نہیں بلکہ جینیس درجہ کے ذہین ترین انسان تھے، لیکن

چونکہ انہوں نے اساتذہ فن اوران علوم کے ماہرین سے بنیادی کتابوں کا درس نہیں لیا، اس لیے ان کی فکر میں ناہمواری، نشیب وفراز، کھاڑیاں بلکہ دلدلیں بھی تھیں۔

مؤرخ وسوانح نگار کے لیے ضروری امر

سیرت وسوانح کے مطالعہ کے ایک شائق اور ایک حقیر سوانح نگار (علامہ ندوی) اور تاریخ نویس کے ذاتی تجربے اور کسی قدر وسیع اور متنوع مطالعہ کی روشنی میں یہ عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کسی شخصیت کی خصوصیات وکمالات، مذاق ومزاج، اور افتاد طبع کو سمجھنے کے لیے اس کے والد مربی کے حالات وخصوصیات خاندانی پس منظر اور اس کے عہد وماحول سے واقف ہونا نہ صرف اس شخصیت کی خصوصیات، نشوو ارتقاء کے عناصر وعوامل کے سمجھنے میں ممد ومعاون ہوتا ہے، بلکہ بعض اوقات ضروری ولابدی ہوتا ہے، اور اس کے بغیر اس کی شخصیت کا منصفانہ و حقیقت پسندانہ مطالعہ، اس کے مختلف اور بعض اوقات متضاد خصوصیات کا تجزیہ وتحلیل دشوار، اور بعض اوقات ناممکن ہوتا ہے۔

ترقی یافتہ ممالک

کسی تعلیم یافتہ اور معزز ملک کے لیے اتنا کافی نہیں کہ وہ سیاسی حیثیت سے طاقتور، معاشی حیثیت سے خوشحال اور خودکفیل ہے، بلکہ اتنا بھی کافی نہیں کہ اس میں درجنوں کے حساب سے یونیورسٹیاں اور سینکڑوں کے حساب سے مدارس اور دانشگاہیں پائی جاتی ہیں، اس سب کے ہوتے ہوئے اس کے امتیاز ونیک نامی اور عزت ووقعت کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس میں قابل لحاظ تعداد میں ہر طرح کے اجتماعی، معاشرتی اور معاشی مفادات سے بے نیاز وبے پرواہ ہو کر علمی وتحقیقی کام کرنے والے، اس کے لیے اپنی زندگیاں وقف کرنے والے اور اس میں بڑی سے بڑی عزت ولذت محسوس کرنے والے دانشور، اہل قلم، بادیۂ بحث وتحقیق کے دیوانے اور شمع علم کے پروانے پائے جاتے ہوں، جن میں سے ایک آدمی نے اکادمی کا کام کیا اور جن کی محنت

وانہماک خود فراموشی وجان سپاری سے پوراپوراکتب خانہ تیار ہو گیااور جن کی زبانِ حال اور کبھی کبھی زبانِ قال (ان کی تندہی اور جفاکشی پر رحم کھانے والوں کو) جواب دیتی رہی ہو کہ ؎

عاشقاں را خستگی راہ نیست
عشق ہم راہ است و ہم خود منزل است

مغرب کا تہذیبی وثقافتی وفکری تسلط

اہل علم ونظر جانتے ہیں کہ نہ صرف ہندوستان، بلکہ اسلامی ممالک میں مغرب کے سیاسی تسلط واقتدار اور جہاں وہ نہیں پہنچ سکا، وہاں اس کی تہذیبی، ثقافتی اور فکری اثرانگیزی اور اس کے معیار ومقیاس، بن جانے کی وجہ سے زیادہ آسان عام فہم، دلچسپ اور زندگی سے تعلق رکھنے کی وجہ سے فلسفہ مابعد الطبیعیات، سائنس پھر سیاست واقتصادیات سے زیادہ تاریخ ذہنوں کو متاثر و مرعوب کرنے مفتوحہ ممالک اور زیر حکومت، یا زیر اثر تعلیم یافتہ نسل میں احساس کمتری، اپنے ماضی اور اپنے قابل فخر اسلاف اور پیش روؤں کے بارے میں بے اعتمادی، بلکہ تحقیر وشرمساری، دینی علوم کی تدوین وترتیب، اور عہد ماضی کے علمی کارناموں کے سلسلہ میں شبہات وشکوک پیدا کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ بن گئی تھی، اور اسی صورت حال نے (جس سے اکثر مسلم ممالک کا واسطہ تھا) قدیم علمی اصطلاح میں ایک نئے علم کلام کی ضرورت پیدا کر دی گئی تھی، جو تاریخ ہی کی زبان میں اور تاریخ ہی کی شہادتوں کی مدد سے اس کا (سپاہیانہ زبان استعمال کرنے سے معذرت کے ساتھ) ترکی بہ ترکی جواب دے۔

سب جانتے ہیں کہ تاریخ روایتوں، واقعات اور جزئیات کا ایک ایسا ذخیرہ اور مواد خام (Raw material) ہے جس سے کسی عہد کا نقشہ یا کسی شخصیت کا مجسمہ اور حلیہ تیار کرنا اور اس کے بارے میں پڑھنے والوں کے ذہن ونقطہ نظر کا تعین وتشکیل ایک مؤرخ کی نیت، طریقِ فکر اور مقاصد کے تابع ہوتا ہے، وہ اگر چاہے تو تاریخ کے چند منتشر اجزاء کو ایک خاص سلیقہ سے

جمع کر کے اس عہد کو مثالی و معیاری عہد اور کسی شخصیت کو پیکر جمال و کمال بنا کر دکھا سکتا ہے، اور اگر اس کا ارادہ اور مقاصد کچھ اور ہیں تو کسی بہتان طرازی و اختراع پردازی کے بغیر اپنی چابکدستی اور محنت سے اسی عہد کو ایک تاریک، پسماندہ اور پر از معائب دور اور اس شخصیت یا سلسلۂ ملوک و حکام کو سر تا پا ظالم و مستبد ثابت کر سکتا ہے۔

الفاظ و کلمات میں حرارت و برودت

راقم (علامہ ندوی) نے اپنے ایک مقالہ میں جو رابطۂ ادب اسلامی کی ایک مجلس میں ''تعارفی و سوانحی ادب اور اس کے تقاضوں و احتیاطوں'' کے موضوع پر پڑھا تھا، عرض کیا تھا کہ جس طرح روز مرہ کی زندگی میں خارجی اجسام کا درجہ حرارت و برودت ہوتا ہے اور تمام اجسام کے لیے (موسموں کے اختلاف کے باوجود) ایک ہی درجہ حرارت و برودت کا تعین نہیں کیا جا سکتا ہے، اسی طرح توصیفی و تنقیدی الفاظ کا بھی درجۂ حرارت و برودت ہوتا ہے۔

قدر شناس

ہر صاحب نظر اور قدر شناس کو اہل فضل و کمال اور اپنے محسنین و محبین کے تذکرے اور ان کے بارے میں اپنے تاثرات و تجربات کو قلم بند اور محفوظ کرنے میں مسرت اور بعض اوقات عزت حاصل ہوتی ہے، لیکن کسی روشن زندہ اور تابندہ چراغ کو پرانے داغوں میں شامل کرنا (خواہ اس کی کتنی ہی ضرورت اور افادیت ہو) ایک دشوار اور ناخوشگوار فریضہ معلوم ہوتا ہے، پھر جب وہ چراغ ایک چراغِ ہدایت ہو۔

انسانی شعور

انسانی شعور کا تعلق عمر، انسان کی اندرونی صلاحیتوں اور ذہانت ہی سے نہیں، ماحول واقعات اور خارجی دنیا سے بھی ہے۔ کبھی کوئی طوفانِ بلا خیز، کوئی خبر صاعقہ آسا، کوئی فتنہ عالم

آشوب یا شہر آشوب کسی کم سن بچہ کے شعور کو قبل از وقت بیدار کر دیتا ہے۔ اور وہ کام کرتا ہے جو ماہ و سال کی گردش اور تعلیم و تربیت کی مسیحائی نہیں کرتی، صور اسرافیل پر اگر مردے جی اٹھیں گے تو ہنگامہ استخیر پرستوں کا جاگ جانا شعور کا بیدار ہو جانا اور بچوں کا بڑوں کے بہت سے احساسات اور گرد و پیش کی دنیا کے واقعات سے باخبر ہو جانا اور ان کا اپنے سن وفہم کے مطابق اپنے بزرگوں کے رنج وغم کا ادراک کرنا محل تعجب نہیں۔

وقت کا عازم وفاتح

بڑوں بڑوں کا عذر یہ ہوتا ہے کہ وقت ساتھ نہیں دیتا اور سروسامان و اسباب کار فراہم نہیں، لیکن وقت کا عازم وفاتح اٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر وقت ساتھ نہیں دیتا تو میں اس کو ساتھ لوں گا۔ اگر سروسامان نہیں تو اپنے ہاتھوں سے تیار کرلوں گا، اگر زمین موافق نہیں تو آسمان کو اترنا چاہیے، اگر آدمی نہیں ملتے فرشتوں کو ساتھ دینا چاہیے، اگر انسانوں کی زبانیں گونگی ہو گئی ہیں تو پتھروں کو چیخنا چاہیے، اگر ساتھ چلنے والے نہیں تو کیا مضائقہ؟ درختوں کو دوڑنا چاہیے، اگر دشمن بے شمار ہیں تو آسمان کی بجلیوں کی بھی کوئی گنتی نہیں، اگر رکاوٹیں اور مشکلیں بہت ہیں تو پہاڑوں اور طوفانوں کو کیا ہو گیا کہ راہ صاف نہیں کرتے، وہ زمانہ کا مخلوق نہیں ہوتا کہ زمانہ اس سے اپنی چاکری کرائے اور وقت کا خالق اور عہد کا پالنے والا ہوتا ہے، وہ زمانہ کے حکموں پر نہیں چلتا، بلکہ زمانہ آتا ہے تاکہ اس کی جنبشِ لب کا انتظار کرے، وہ دنیا پر اس لیے نظر نہیں ڈالتا کہ کیا کیا ہے، اس سے دامن بھرلوں، وہ یہ دیکھنے کے لیے آتا ہے کہ کیا کیا نہیں ہے؟ جس کو پورا کروں۔

اندرونی محرکات

انسان کے فیصلوں کے اندرونی محرکات، اور انسان کی مجبوریوں کا اندازہ ہر ایک نہیں لگا سکتا۔

فلسطین کی سرزمین

ایک ایسی سرزمین جس کی خدمت کے لیے تقدیر الٰہی نے ہمیشہ اولوالعزم سلاطین اور جانباز اور جانفروش مجاہدین کا انتخاب کیا، وہ فہرست فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے شروع ہو کر صلاح الدین ایوبی سے لے کر خلیفہ المسلمین سلطان عبدالحمید پر ختم ہوتی ہے۔ اس فہرست میں ناموں کا اضافہ ہوتا رہا۔

عربوں کی تاریخ کا سب سے تاریک دن

اگر عربوں کی تاریخ کبھی صداقت و دیانت کے ساتھ لکھی جائے گی تو یہ لکھا جائے گا کہ عربوں کی تاریخ کا سب سے تاریک دن یا منحوس گھڑی وہ تھی جب عربوں نے خلافتِ عثمانیہ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا، جو مقاماتِ مقدسہ کی محافظ اور امین تھی، اس سے بڑھ کر مہلک غلطی عربوں نے آج تک نہیں کی۔

پسندیدگی کا آئین

محبت کی طرح پسندیدگی کا آئین بھی سب سے نرالا ہے اس کے لیے بھی کوئی کلیہ و ضابطہ نہیں۔

اقبال کا کلام

اقبال اور حالی کے کلام کا سنجیدگی اور احترام سے مطالعہ کیے بغیر ملت اور ملت کے بخشے ہوئے فضائل کا ادراک و احساس آسان نہیں ہے۔ یہ فیضان ہے عشق رسول کا، جس نے ان شعراء کے کلام کو گران مایہ اور لازوال بنا دیا، یہ کچھ شاعروں ہی پر موقوف نہیں ہے، بلکہ ہر مسلمان کا مذہبی اور تہذیبی معیار یہ ہے کہ اس کی زندگی اور اس کا کردار کس حد تک عشق رسول

سے مشرف و مستنیر ہے۔ اقبال کے متعلق انہوں نے یہ آخری بات لکھ دی کہ اقبال کا کلام اس صدی کا علم کلام ہے اور اب مذہب و زندگی کی تفہیم اسی طرح اور اسی سیاق و سباق میں کی جائے گی جو ہم کو اقبال کے یہاں ملتی ہے۔

رائے قائم کرنے کا حق

ہر پڑھے لکھے اور صاحب فکر کو رائے قائم کرنے اور اپنی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کے لیے انتخاب کرنے کا حق حاصل ہے اور اس میں کسی صاحب شعور اور صاحب ضمیر آدمی کے اخلاص و نیک نیتی پر شبہ کرنے کی ضرورت نہیں۔

اردو کے عناصر اربعہ

اردو کے عناصر اربعہ (۱) مولانا حالی (۲) مولانا شبلی (۳) ڈپٹی نذیر احمد (۴) اور مولوی محمد حسین آزاد۔

خاندانی اثرات

خاندانی و موروثی اثرات بڑے طاقتور ہوتے ہیں، وہ نسل در نسل منتقل ہوتے رہتے ہیں، اور بچوں اور بچیوں سب میں ان کے اثرات کم و بیش پائے جاتے ہیں۔

دینی عربی مدارس

ہمارے دینی عربی مدارس عرصۂ دراز سے ہر قسم کے ہنگامہ سے دور اور زندگی کے سمندر میں خاموش اور الگ تھلگ جزیروں کی حیثیت رکھتے ہیں، ہندوستان میں انگریزوں کے عہد سے جو تعلیمی انقلاب شروع ہوا، پھر اس ملک میں جو سیاسی اقتصادی تبدیلیاں رونما ہوئیں ان کے نتیجہ میں آسودہ حال، ذہین و باصلاحیت خاندانوں کے بچے اور ہونہار نوجوان زیادہ تر اپنے شہروں

اور قصبات کے اسکولوں، کالجوں اور اگر اس سے زیادہ حوصلہ مندی اور وسائل ہوئے تو پھر اٹاوہ کے اسلامیہ اسکول اور علی گڑھ کی مسلم یونیورسٹی بھیجے جاتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے یہ قومی ادارے اور جدید تعلیم کے مراکز مسلمان ''شاہین بچوں'' کا مرکز بن گئے، اور انہی نے دور آخر میں انگریزی زبان کے ادیب و انشاء پرداز سیاسی اور قومی میدان کے خطیب و مقرر اور محکموں کے اعلیٰ افسر، قانون ساز مجالس کے ممبر، وزارت و حکومت میں حصہ لینے والے پیدا کئے، ہونا تو نہیں چاہیے تھا مگر ہوا یہی کہ عام طور پر جن سرپرستوں اور والدین کے پاس اعلیٰ تعلیم دلانے کے لیے وسائل نہیں تھے (یا ان پر کسی وجہ سے دین کا غلبہ تھا) وہ اپنے بچوں کو عربی مدارس میں بھیجتے تھے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں پڑھنے والوں کی بڑی تعداد جدت فکر ''جرأت اندیشہ'' اور طباعی کے اس جوہر سے محروم ہوئی جو اقتصادی نسلی فطری اور روایتی اسباب کے بناء پر جدید دانشگاہوں کے حصہ میں زیادہ آئی۔

لیکن نہ یہ عربی مدارس کے حق میں کوئی کلیہ تھا جس میں کوئی استثناء نہیں، نہ جدید دانش گاہوں کے حق میں، دونوں طرف بکثرت استثنائی مثالیں ملتی ہیں۔ جدید تعلیم گاہوں میں اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم پانے والوں کی ایک بڑی تعداد ذہانت و جرأت کے جوہر سے محروم، لکیر کے فقیر اور رٹے ہوئے طوطوں کی طرح اپنے ذہن و دماغ سے کام لینے کے جوہر سے عاری ہے، اور اس کے برخلاف مدارس میں تعلیم پانے والے سادہ اور محدود ماحول میں زندگی گزارنے والے طلباء میں ایسے لوگ نکلتے رہتے ہیں، جن میں بعض اوقات عقابی روح اور شاہین کا جگر ہوتا ہے، لیکن عام طور پر یہ اس وقت ہوتا ہے جب کسی اچھی کان کا ہیرا یا کسی پھلنے پھولنے والے باغ کا ثمر نورس، کسی علمی اور دینی خاندان کا نونہال (جس کے سلسلہ میں پشتہا پشت سے علم اور ذہانت چلی آرہی ہے) آجاتا ہے۔ پھر انہی مدارس سے ایسے فضلاء نکلتے ہیں جن کی ذہانت و طباع، جرأت و ہمت، خود اعتمادی و خود شناسی شخصیت کی دلآویزی و دلربائی، قوت تقریر و تحریر کے سامنے کسی بڑی سے بڑی ملکی یا بیرونی دانشگاہ کے فضلاء اور مغربی زبان کے ماہرین کا چراغ نہیں جلتا، وہ جس

میدان کی طرف رخ کرتے ہیں اپنی ذہنی و علمی صلاحیت، اپنی قوت عمل اور اپنے امتیاز کا نقش قائم کردیتے ہیں اور اقبال کا یہ شعر یخ بستہ مدارس پر بھی صادق آتا ہے۔

اسی دریا سے اٹھتی ہے وہ موج تند جولاں بھی
نہنگوں کے نشیمن جس سے ہوتے ہیں تہ وبالا

اس کی بڑی بڑی مثالیں دی جاسکتی ہے، اور قدیم نظام تعلیم کے ساختہ پرداختہ اور عربی مدارس کے ایسے فضلاء کے نام پیش کیے جاسکتے ہیں، جن کا سارے ہندوستان نے نہیں بلکہ ساری دنیا نے لوہا مان لیا، اور ان سے ہندوستان کا نام روشن ہوا انہوں نے آزادی کی تحریک میں قائدانہ کردار ادا کیا۔ عربی فارسی اور اردو کتب خانوں کو اپنی بلند پایہ تصنیفات سے مالا مال کردیا، اپنے ملک کی زبان وادب کی طرف توجہ کی تو اس میں بھی اپنی برتری اور انفرادیت ثابت کردی، تاریخ و تحقیق کی طرف متوجہ ہوئے تو اس میدان میں بھی جھنڈے گاڑ دیئے۔ سیاست کی طرف رخ کیا تو اس میدان میں بھی اپنی ضرورت تسلیم کرالی۔ یہ فہرست بہت طویل ہے۔ اور ان باوقار ناموں کے درج کرنے میں یہ نزاکت بھی ہے کہ کہیں کوئی اہم نام چھوٹ جائے، اور یہ بھی خطرہ ہے کہ ان سے مماثلت نہ سمجھی جائے۔ کہنا صرف یہ ہے کہ ان مدارس میں بھی وقتاً فوقتاً ایسے بچے یا نوجوان آجاتے ہیں جن میں فطری یا خاندانی طور پر ذہانت وطباعی کا خداداد جوہر ہوتا ہے۔ ان کی طبیعت میں اخذ کرنے اور دوسروں تک پہنچانے کی صلاحیت، ان کی فطرت میں وہ بے چینی وبیتابی ہوتی ہے جو بعض اوقات ان کو ایک شعلہ جوالہ بنادیتی ہے۔ قسمت سے اگر کسی ادارہ کو ایسے کچھ نوجوان مل جائیں اور وہ بھی اقبال کے مصرعہ۔

شجر سے پیوستہ رہ امید بہار رکھ

پر نظر رکھتے ہوئے کسی جماعت سے منسلک یا کسی دعوت سے مربوط رہیں تو بڑا کام کرلیے جاتے ہیں اور ملت کے لیے بڑے مفید ثابت ہوتے ہیں۔

علمی ذوق و شغف

کسی فن میں کامل اور نامور ہونا اور بات ہے، اور اس کا تصنیفی ذوق اور اس میں شغف و انہماک اور بات ہے۔ اپنی اس مختصر زندگی میں اکثر یہ دیکھا کہ اکثر لوگ خاص ماحول اور خاص اوقات میں، صاحب علم اور صاحب ذوق نظر آتے ہیں باقی اوقات میں ان میں کوئی علمی دلچسپی شوق و مطالعہ جستجو اور کتابی ذق نظر نہیں آتا، در حقیقت ان میں طالبعلمانہ روح نہیں ہوتی۔ اس بارے میں میں نے دو شخصیتوں کو مستثنیٰ پایا ایک مولانا انور شاہ کشمیری، دوسرے مولانا سید سلیمان ندوی، اول الذکر کو کم دیکھا، اور ان کی مجلسوں میں شرکت کا اتفاق ایک دو بار ہوا، مگر ان کی مجلسوں کو علمی تذکروں اور تحقیق و افادات سے معمور پایا، لیکن سید صاحب کو خوب دیکھا، سفر و حضر میں رفاقت رہی، اور کئی کئی دن مسلسل ساتھ رہنا ہوا، ان کا علمی ذوق ہر جگہ اور تقریبًا ہر وقت قائم رہنا، مطالعہ غور و فکر علماء و اہل فن سے تبادلۂ خیال اور بحث و نظر کا سلسلہ جاری رہتا وہ فطرتًا طالب علم تھے، اور ان کا اصلی ذوق اور رفتار طبع یہی تھی، مطالعہ ان کی غذا اور ان کا لازمۂ زندگی تھا، بیماری میں بھی ان کا ذہن کام کرتا رہتا تھا، اور نقاہت و ضعف کی حالت میں بھی ان کا مطالعہ جاری رہتا، دیکھنے میں یہ معمولی بات ہے، لیکن قدیم و جدید حلقوں میں اب جو علمی بے تعلقی و بے ذوقی بڑھتی جا رہی ہے۔ اس کے پیشِ نظر کسی زمانہ میں یہ ایک یادگار بات ہوگی۔

وسعتِ نظر

سید صاحب (سلیمان ندوی) نے جن اساتذہ اور علمی سرپرستوں کی رہنمائی اور جس ماحول میں ذہنی و علمی تربیت حاصل کی تھی اس کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ ان کی نظر میں وسعت اور ان کی طبیعت میں اعتدال تھا، نہ ان میں بہت سے قدیم علماء کا سا جمود اور گروہی عصبیت تھی، نہ جدید طبقہ کی عجلت و سطحیت اور یورپ کی مرعوبیت تھی، وہ اپنے تعلیمی خیالات سے لے کر فقہی مسلک تک وسیع النظر، وسیع القلب اور معتدل تھے۔ اگر یہ صنعت ان میں نہ ہوتی تو ان کو مولانا محمد علی

کی رفاقت، مؤتمر اسلامی کی شرکت سفر افغانستان، علی گڑھ اور جامعہ ملیہ کے تعلقات ہر جگہ دشواری محسوس ہوتی۔ یہی نظر کی وسعت اور قلب کی فراخی تھی کہ انھوں نے ہندوستان کی ایک نامور علمی جماعت اور مشہور ادارہ کے سب سے بڑے آدمی ہوتے ہوئے اور اپنے مخصوص تعلیمی واصلاحی خیالات رکھنے کے باوجود مولانا اشرف علی تھانوی سے رجوع واستفادہ کیا اور اس میں ان کو کوئی رکاوٹ محسوس نہیں ہوئی، وسعت نظر کی ایسی مثالیں طبقۂ علماء میں کم ملیں گی۔

بڑوں کی صحبت

میری زندگی میں وہ بڑا مبارک دن اور بڑی سعید گھڑی تھی۔ جب مولانا احمد علی صاحب لاہوری امیر انجمن خدام الدین تیرانوالہ دروازہ لاہور سے نیاز حاصل ہوا۔ میری زندگی کے دو بڑے موڑ ہیں، جہاں سے زندگی نے نیا راستہ (جہاں تک خیال ہے بہتر اور مبارک راستہ) اختیار کیا۔ پہلا موڑ جب مولانا احمد علی سے تعلق پیدا ہوا، دوسرا موڑ اس وقت پیش آیا جب خدا نے مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس پہنچایا۔ اگر مولانا احمد علی صاحب سے ملاقات نہ ہوتی تو میری زندگی اچھی یا بری بہر حال موجودہ زندگی سے بہت مختلف ہوتی اور شاید اس میں ادب و تاریخ اور تصنیف و تالیف کے سوا کوئی ذوق اور رجحان نہ پایا جاتا، خداشناسی اور خدارسی راہ یابی اور راست روی تو بڑی چیزیں ہیں۔ مولانا کی صحبت میں کم سے کم خداطلبی کا ذوق، خدا کے نام کی حلاوت اور مردان خدا کی محبت اپنی کمی اور اصلاح و تکمیل کی ضرورت کا احساس پیدا ہوا، اور ہم عامیوں کے لیے یہی بڑی دولت و نعمت ہے۔ بلکہ بعض حقیقت شناسوں کے نزدیک یہی اصل دولت ہے، وحشت کلکتوی نے انہی لوگوں کی ترجمانی اپنے اس شعر میں کی ہے۔

نشانِ منزل جانان ملے ملے نہ ملے
مزے کی چیز ہے یہ ذوق جستجو میرا

مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کے درسِ قرآن کے تین مرکزی مضامین

مولانا کے درس کے تین اہم بڑے مرکزی مضمون تھے۔

۱- عقیدہ توحید کی وضاحت، جو ہر قسم کے شرکیہ اثرات و رسوم سے پاک تھی اور جس میں ان کا طرز مولانا اسماعیل شہید (صاحب تقویۃ الایمان) سے بہت ملتا جلتا تھا۔ نیز انہیں کے ایک دوسرے نامور معاصر اور بزرگ مولانا حسین علی شاہ صاحب (واں بچھراں ضلع میانوالی) کے طرز تفسیر اور انداز تبلیغ سے بہت ملتا ہوا تھا۔ یہ چونکہ خود اپنے خاندانی مسلک کی ترجمانی اور تائید تھی، اس لیے دل نے اس کا خوب ذائقہ لیا اور دماغ نے پورے طور پر قبول کیا۔

۲- دوسرا مرکزی مضمون اہل اللہ کے مؤثر اور دلآویز واقعات، بالخصوص اپنے سلسلہ کے مشائخ کی محبت میں بالکل سرشار تھے، اور جیسا کہ محبت کا قاعدہ ہے، وہ ان کے تذکرہ کے لیے کوئی نہ کوئی تقریب پیدا کر لیتے تھے، وہ جس وقت ان کا تذکرہ کرتے تھے، تو معلوم ہوتا تھا کہ ان کے منہ میں پانی بھر آیا ہے، اور وہ کسی نہایت شریں اور محبوب چیز کا مزہ لے لے کر ذکر کر رہے ہیں، ان کے دو روحانی مربی و شیخ تھے، مولانا سید تاج محمود صاحب امروٹی اور خلیفہ غلام صاحب دین پوری، وہ جس وقت ان دونوں بزرگوں کا تذکرہ کرتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ ان کے ہر بن مو سے تشکر و امتنان اور محبت و عقیدہ کا چشمہ ابل رہا ہے، اور کسی نے ان کے دل کا ساز چھیڑ دیا ہے، سامعین کے دل ان تذکروں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے چنانچہ قدرۃً یہ عقیدت و محبت ان کے دل سے سننے والوں کے دلوں کو منتقل ہوتی تھی، اور بجلی کی کرنٹ کی طرح دوسروں کے جسم و جان میں بھی دوڑ جاتی تھی۔

۳- تیسرا مرکزی مضمون جذبہ جہاد بغض فی اللہ اور انگریزی سے شدید دشمنی اور نفرت کا مضمون تھا، جو بار بار درس میں آتا تھا، اور خود قرآن مجید کی آیات ان کی رہبری کرتی

تھیں۔

ذہانت

ذہانت بڑی خلاق اور جدت پسند واقع ہوئی ہے، وہ بے جان تصویروں میں جان، اختصار میں تطویل اور اجمال میں تفصیل پیدا کردیتی ہے، اور چند لفظوں اور لکیروں سے جو بعض اوقات خوردبین کے بغیر دیکھی نہیں جاسکتیں، ایک پورا شہر تعمیر کرلیتی ہے۔

احمد علی لاہوری کے دو مؤثر ذریعے

درسِ قرآن کے علاوہ اس کے دو اور مؤثر ذریعے تھے:

(۱) ایک جمعہ کا خطبہ

(۲) دوسرے عام فہم اصلاحی رسائل کی اشاعت۔

جمعہ کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ ان کی زندگی میں پنجاب میں اتنا بڑا جمعہ اور اتنی مؤثر و مقبول جمعہ کی تقریر کہیں نہیں ہوتی تھی، لوگ دور دور سے آتے تھے، اور بہت پہلے سے منتظر رہتے تھے۔ مولانا جمعہ کے خطبہ سے پہلے جس کی عربی میں دینے کی پابندی فرماتے تھے پورے ایک گھنٹہ اردو میں تقریر فرماتے تھے۔ یہ تقریر خالص اصلاحی اور تبلیغی رنگ کی ہوتی تھی، اس کی سب سے بڑی خصوصیت اور طاقت مولانا کی صاف گوئی، بے خوفی اور ہر قسم کی مصلحت اندیشی سے بے پروائی تھی۔ یہ تقریر بالکل مطابق حال ہوتی تھی اس سے غلط عقائد، فاسد اخلاق، غیر دینی اور غیر شرعی رسوم و اعمال، غیر اسلامی معاشرت و تمدن پر ضرب کاری لگتی تھی، اور ہر وہ شخص جو اس میں مبتلا ہوتا تھا، اس ضرب اور اس کی چوٹ کو محسوس کرتا تھا اور اثر لیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ مولانا اس میں کسی رعایت و مداہنت اور اشارے کنایۓ سے قطعاً کام نہیں لیتے تھے۔ اہل حکومت اہل وجاہت، اہل ثروت اور دنیا دار علماء و مشائخ اور دین کو پیشہ بنانے والوں اور غلط پیروں پر سخت تنقید کرتے تھے، بعض مرتبہ ان کی تنقید اتنی سخت ہو جاتی تھی کہ سننے والوں کو

حیرت ہوتی تھی کہ لوگ کیسے برداشت کر لیتے ہیں، مجھے تو کئی مرتبہ ڈر معلوم ہوا کہ کہیں یہ سامعین کی برداشت سے باہر نہ ہو جائے اور ان کی زخم خوردہ انانیت اپنے کرب کو چھپا نہ سکے اور انتقام لینے اور بے ادبی پر آمادہ نہ ہو جائے، لیکن ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا، صاف معلوم ہوتا تھا کہ ان کا اخلاص اور ان کی بے غرضی اور بے نفسی پھر ان کی عنداللہ و عندالناس مقبولیت کسی فتنہ کو اٹھنے نہیں دیتی۔

احمد علی لاہوری ایک صاحب کشف و کرامت بزرگ

سننے والوں کے کانوں میں اب بھی یہ الفاظ گونج رہے ہوں گے کہ اے لاہوریو! احمد علی چھیالس برس سے تمہارے درمیان رہتا ہے، لیکن وہ اس اٹھارہ لاکھ کی آبادی میں انسان کی صورت دیکھنے کو ترستا ہے تم سب کچھ ہو مگر انسان نہیں ہو۔

عظیم شخصیت عظیم عادات

مولانا (احمد علی لاہوری) تبلیغی دورے بھی فرماتے تھے، لیکن اس میں ان کے شرائط اتنے سخت تھے کہ بعض اوقات مہینوں ان کی نوبت نہ آتی تھی، اس میں ایک شرط یہ تھی کہ اپنے ہی کرایہ سے تشریف لے جائیں گے۔ اس کے لیے بعض اوقات مہینوں انتظار کرنا پڑتا تھا۔ دوسری شرط یہ تھی کہ جب تک وہاں قیام رہے گا اپنا ہی کھانا کھائیں گے۔ فرماتے تھے کہ جہاں تبلیغ کرنی ہو وہاں کا کھانا کھا لینے بلکہ بعض اوقات شربت پی لینے سے بھی اثر پڑ جاتا ہے اور آدمی اتنی صفائی اور جرأت سے امر بالمعروف نہی عن المنکر اور احقاق حق کا فریضہ انجام نہیں دے سکتا۔

ہندوستان میں عربی ادب

ہندوستان میں عربی زبان و ادب کے صحیح ذوق، صحیح طریقہ تعلیم اور ایک زندہ جیتی جاگتی زبان کی حیثیت سے اس کا استعمال اسی مدرسہ (شیخ خلیل عرب کا گھر جس میں علامہ ندوی اور عرب

صاحب کے چھوٹے بھائی پڑھتے تھے) سے شروع ہوا، جس کا نہ کوئی نام تھا نہ کوئی سائن بورڈ، نہ حاضری کا کوئی رجسٹر، نہ امتحانات کا باقاعدہ نظام، وہاں کے فضلاء کو کوئی سند فراغ ملتی تھی نہ کوئی خطاب ولقب، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اسی مدرسہ سے ہندوستان میں عربی تعلیم اور عربی انشاء وتحریر کے اس نئے دور کا آغاز ہوا، جس کو علامہ تقی الدین ہلالی مراکشی کی آمد اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اساتذہ اور فضلاء نے نقطۂ عروج تک پہنچا دیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ یونیورسٹی کی ملازمت ایک بہانہ تھا، خدا کی حکمت اور اس کی کارسازی ان کو ڈھاکہ سے جہاں وہ عرصہ سے معلمی کے فرائض انجام دے رہے تھے، لکھنؤ خاص اسی مقصد وخدمت کے لیے لائی تھی کہ وہ ہندوستان میں قرآن کی زبان کی صحیح تعلیم، اور ممالک عربیہ میں اسلام کی دعوت کے لیے ایک ہراول دستہ تیار کریں۔

گمنام بلند مقام شخصیات

کسی انگریز ادیب نے کسی گور غریباں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ کوئی نہیں جانتا کہ اس قبرستان میں کیسے کیسے شیکسپیئر اور ملٹن دفن ہیں۔ جن کے کمالات کا اظہار نہیں ہوسکا اور وہ گمنامی میں زندگی گزار کر گمنام انسانوں کی طرح زیر خاک ہوگئے۔

قبولیت ومقبولیت

جوہر انسانیت، مکارم اخلاق، درد مند دل، خدمت خلق، فیض رسائی عام، قبولیت و مقبولیت ان میں سے کوئی بھی دولت کسی طبقہ کے ساتھ مخصوص نہیں۔ ﴿ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ﴾۔

شعوری غیر شعوری

کوئی کیسا ہی اعلیٰ درجہ کا جمہوری اور ترقی یافتہ ملک ہو اور اس ملک کے انتظامی افسروں اور

حکام حکومت کے کارکنوں اور اہل کاروں میں ذمہ داری کا احساس اور فرض شناسی کا جذبہ کتنا ہی بڑھا ہوا ہو، کچھ لوگوں کے ساتھ شعوری یا غیر شعوری طور پر ناانصافی، حق تلفی کا معاملہ اور بھول چوک ہوتی ہی رہتی ہے، اس میں کسی خاص فرقہ کی خصوصیت نہیں، ایسے موقعہ پر ایسے خدا ترس انصاف دوست، اور درد مند اعلیٰ افسران اور حکام کی اخلاقی مدد اور ہمدردی کی ضرورت ہوتی ہے، جو اپنے رسوخ اور اثر سے کام لے کر انصاف کے راستہ کو مختصر بنا سکیں۔ اور جن کی توجہ سے وہ غریب بھی اپنا حق پا سکیں جو کسی کوتاہ نظری یا غلط فہمی یا ذاتی رجحان کا شکار ہو گئے۔ ایسے لوگوں کا وجود ہر سوسائٹی میں باعث رحمت ہوتا ہے اور وہ قانون میں مزاحم نہیں بلکہ بڑے معاون ہوتے ہیں۔

تصوف و تزکیہ

صرف ادب، فکر و نظر اور معلومات و مطالعہ ہی سب کچھ نہیں، بلکہ کچھ اور کیفیات و حالات بھی ہیں، جو مخصوص ذہانت مطالعہ اور ضوابط سے پیدا نہیں ہوتے یعنی یقین، اخلاص، ایمان واحتساب شدت تعلق مع اللہ، ذوق دعا، درود و محبت، جس طرح سے احکام و ضوابط کا سلسلہ محفوظ و متوارث چلا آرہا ہے اسی طرح یہ احوال و کیفیات بھی یکسر ضائع اور ناپید نہیں ہو گئے ہیں، اور جس طرح پہلی چیز کے لیے وسائل، اساتذۂ فن اور نظام ہے، اسی طرح دوسری چیز کا ماخذ و ذرائع موجود ہیں، اور اس کے لیے بھی اہتمام و طلب کی ضرورت ہے، یہ چیز روح شریعت اور فقہ باطن ہے۔ اس کا منصوص نام کتاب و سنت کے زبان میں تزکیہ و احسان ہے۔ بعد کی صدیوں میں معلوم نہیں کیوں اس کا نام تصوف پڑ گیا اور اس کے ساتھ بعض ایسی چیزیں شامل ہو گئیں جن کا حقیقتاً شریعت میں ثبوت نہیں، یہ نام اور بعد کے لوازم بہت سی طبیعتوں کے لیے موجب بعد اور وحشت بن گئے۔ لیکن جو شخص اس شعبہ کی روح کے کاملین اور فن کے مجتہدین کو دیکھتا ہے، اس کے اندر یہ اذعان پیدا ہو جاتا ہے کہ اس کی اصل اور اس کی روح شریعت کا عین مطلوب

اور نبوت کی میراث ہے۔ وہ آسانی سے اصل و زوائد میں تمیاز کرلیتا ہے۔

جس محبت کو دوام ہے

عارفین کا قول و تجربہ ہے کہ جو محبت صفات و منافع سے وابستہ ہوتی ہے اس کا کچھ زیادہ اعتبار نہیں کہ صفات و منافع میں زوال و تغیر واقع ہوتا رہتا ہے۔ اور محبت اس کے مطابق گھٹتی بڑھتی اور قائم و زائل ہوتی رہتی ہے۔ لیکن جو محبت ذات سے قائم ہوتی ہے اس کو زیادہ خطرہ نہیں۔

دوائے دل

خواجہ عزیز الحسن مجذوب کے کچھ اشعار جو انہوں نے غالبًا اپنے مرشد کی وفات پر کہے تھے، بے اختیار زبان قلم پر آگئے، ان کا نقل کردینا شاید مناسب حال ہو۔

ہجر کی شب عجب ہے شب حال پہ کیا ہے العجب
تارے ہیں روشنی نہیں، چاند ہے چاندنی نہیں
شیشہ ہے جام ہے نہ خم اصل تو رونقیں ہیں گم
لاکھ سجا رہے ہو تم بزم ابھی سجی نہیں
جائیں یہ چشم نم کہاں اس کی وہ بزم جم کہاں
پہلے سے اب کرم کہاں زلف یہ زلف ہی نہیں
بیٹھا ہوں میں جھکائے سر نیچی کیے ہوئے نظر
بزم میں سب سہی مگر وہ جو نہیں تو کچھ نہیں
اے مرغ باغ آرزو کیا ہے باغ ہائے تو
کلیاں تو گو ہیں چار سو کوئی کلی کھلی نہیں

دل میں لگائے اس کی لو کر دے جہاں میں نشر وضو
شمعیں تو جل رہی ہیں سو، بزم میں روشنی نہیں

انسان پر خاندانی اثر

انسان کے مزاج و مذاق کی تشکیل، اس کے فطری جوہر چمکانے اور اکثر اوقات اس کے زندگی کا رخ متعین کرنے میں، اس کے خاندان اور اس کے قریبی اجداد کا اثر علم الحیات اور علم النفس کی ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ جس کی تصدیق گزشتہ تاریخ، نیز پے در پے مشاہدات و تجربات سے ہوتی رہتی ہے، اور اس کا انکار ایک امر بدیہی کا انکار ہے۔

یہ اثر انسان پر دو راستوں سے ہوتا ہے، ایک نسلی طور پر کہ یہ خصائص (کمالات و کمزوریاں) باپ سے بیٹے کی طرف اور مورث سے والد کی طرف منتقل ہوتے ہیں۔ دوسرے ذہنی و فکری طور پر کہ خاندانی روایات اور آباؤ اجداد کے قابل فخر کارناموں کا تذکرہ ان کے اصول زندگی، عقائد و مسلمات اور ان معیار و اقدار کا چرچا جن کو وہ ہمیشہ سینہ سے لگائے رہے اور جوان کو جان سے زیادہ عزیز تھے، ان محبوب اور معیاری شخصیتوں کے نام جن کی عقیدت و عظمت ان کے دل و دماغ کی گہرائیوں میں بیٹھ گئی تھی، اور ان مقاصد کا ذکر جن کے لیے انہوں نے بڑی سے بڑی قربانی پیش کرنے سے دریغ نہیں کیا، بچپن سے انسان کے کان میں پڑتا رہتا ہے، اور اس کے دل و دماغ کی سادہ تختی پر "نقش کالحجر" ہو جاتا ہے، اور یہ سب چیزیں شعوری اور غیر شعوری طریقہ پر (اور اکثر غیر شعوری طریقہ پر) اس کی شخصیت و سیرت کی تعمیر اور اس کی صورت گری کرتی ہیں۔

اسی حقیقت کے پیش نظر قدیم و جدید سوانح نگاروں نے صاحب سوانح کے خاندان کا تعارف اور اس کے اسلاف و آباؤ اجداد کا تذکرہ اس کے حالات و کمالات کے تذکرہ اور اس کی سوانح حیات لکھنے سے پہلے ضروری سمجھا ہے، اور اس بارے میں اپنے اپنے زمانہ کے مذاق،

صاحب سوانح کے درجہ اور پایہ اور اپنی تصنیف کے پیمانہ کے مطابق ایجاز و اختصار یا تفصیل و اطناب سے کام لیا ہے۔ یہ محض ایک رسم کہن کی پیروی اور مجرد روایت پرستی نہیں، بلکہ انسانی زندگی کے عمیق و وسیع مطالعہ اور حقیقت پسندی پر مبنی ہے کہ کسی انسان کی شخصیت کے عناصر ترکیبی کا سمجھنا اس کی پسند و ناپسند، اس کے ترک و انتخاب، اس کی محبت و نفرت کے اندرونی محرکات، اس کی مثالی شخصیتوں اور قابل تقلید نمونوں کے اختصار کرنے کے اسباب اور مقاصد زندگی کے تعین کی اصل وجہ اس وقت تک نہیں معلوم ہوتی ہے، جب تک اس ''ماحول'' کا جائزہ نہ لیا جائے جس میں اس نے نشو ونما پائی۔

یہ ماحول صرف وہ محلہ اور بستی نہیں ہے، جس میں اس کی پیدائش اور پرورش ہوئی، بلکہ ذہن و خیال، تذکروں اور چرچوں روایات و واقعات، ترغیب و تحریض، تعلیم و تلقین اور افتخار و اعتماد کی وہ فضا بھی ہے، جس میں اس نے ہوش سنبھالا اور عقلی و ذہنی ارتقاء کے منازل طے کئے، بعض مرتبہ یہ ماحول ان بیدار فطرت بچوں کے لیے جن کی داشت پر داخت خاص اہتمام کے ساتھ کی جاتی ہے محلہ اور بستی کے ماحول سے زیادہ مؤثر ثابت ہوتا ہے۔

اسی اصول کے بناء پر قدیم اسلام اور عہد قدیم کی شخصیتوں اور بعید العہد اجداد کے مقابلہ قریبی اجداد اور قریبی عہد کی شخصیتوں کا اثر دل و دماغ پر زیادہ گہرا ہوتا ہے کہ قدیم شخصیتوں کے مقابلہ میں (خواہ وہ اپنی شہرت و عظمت کے بناء پر زیادہ بلند رتبہ اور زیادہ قابل احترام ہوں) قریبی بزرگوں کے تذکرے زیادہ کان میں پڑتے رہتے ہیں اور ان سے متاثر ہونے اور ان کی تقلید و پیروی کرنے کے زیادہ مواقع آدمی کو حاصل ہوتے ہیں۔

الولَدُ سِرٌّ لأبيه

اجداد قریب کی امتیازی صفات کا بیٹوں اور پوتوں کی طرف منتقل ہونا ایک مسلمہ حقیقت ہے، اسی بناء پر بجا طور پر الولد سرّ لأبیه کہا گیا۔

بچے نبض شناس

بچوں کو بزرگوں کی نقل کرتے ہوئے بارہا دیکھا گیا ہے۔ ان علماء کے بچے جن کے یہاں کتابوں کا ذخیرہ پایا جاتا ہے، اور ہر طرف ان کا اہتمام نظر آتا ہے اپنے سن اور تعلیم کے مطابق اپنا چھوٹا کتب خانہ بناتے اور اس کو سجاتے ہوئے دیکھے گئے ہیں۔ حکماء واطباء کے بچوں کو بڑی معصومیت کے ساتھ لوگوں کی نبض دیکھتے اور نسخہ بولتے پایا گیا ہے۔ اساتذہ اور مدرسین کے بچوں کو شاگردوں کا پرّا جما کر پڑھانے کی نقل کرتے ہوئے دیکھا گیا ہے اور مشائخ کی کمسن اولاد کو اپنے ہم عمروں میں شیخ بن کر توجہ دیتے دیکھا گیا ہے۔

وہ تھے زمانے میں معزز ہو کر

اس زمانہ میں عام دستور تھا کہ علوم دینیہ کے وہ طلباء طبعًا ملازمت اور اس قسم کی پابندیوں کو پسند نہیں کرتے تھے جن سے ان کی آزادی میں فرق پڑے، اور عزت نفس پر حرف آئے، باعزت طریقہ پر معاش حاصل کرنے کے لیے فن طب کی تحصیل کرتے تھے۔ عرصہ تک درس نظامی میں طب کی بعض کتابیں بھی داخل رہی ہیں۔ جن سے ایک گونہ اس فن سے مناسبت پیدا ہو جاتی تھی۔ پھر جو لوگ اس میں مہارت پیدا کرنا چاہتے تھے وہ درسیات سے فارغ ہو کر کسی استاد فن یا نامی طبیب سے اس فن کی تکمیل کرتے تھے۔

کسب معاش

اس میں شک نہیں کہ کسب معاش و خودداری کسی حد تک شرعًا محمود ہے، لیکن اس کو نہ بھولنا چاہیے کہ یہ سب وسائل ہیں اور مقصود خدا طلبی ہے۔ وسیلہ کو وسیلہ اور مقصود کو مقصود سمجھنا فرض ولازمۂ انسانیت ہے۔ اگر کوئی شخص وسیلہ کو مقصود پر ترجیح دے تو سب وہی کہیں گے جو ایک دیرینہ سال تجربہ کار فاضل ریفارمر کہہ گیا ہے۔

نبا شد دل آں فرو مایہ شاد
کہ از بہر دنیا دہد دیں بباد

مسلمانوں کی تنزلی

آج کل علی العموم مسلمانوں کی حالت جو تنزل وادبار کی انتہاء درجہ پر پہنچ گئی ہے، اس کے چند سبب سمجھے جاتے ہیں، اولاً نفاق باہمی، دوسرے علماء کی کم توجہی، اور درحقیقت عقل سلیم بھی اسی کو مقتضی ہے۔ ان دونوں باتوں کا نتیجہ یہی ہوسکتا ہے جس کو ہم فی زمانہ دیکھ رہے ہیں۔ لیکن علماء کی کم توجہی کا سب سے بڑا سبب یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ خود زمانہ کی ضرورتوں سے ناواقف ہیں۔

ایک وہ زمانہ تھا

ایک وہ زمانہ تھا کہ مسلمانوں کی قومی عزت قائم تھی۔ انہیں کی حکومت تھی، انہیں کا علم وہنر تھا، تہذیب وتمدن کے خزانے انہیں کے قبضہ میں تھے۔ تجارت وزراعت کے بھی مالک تھے، قصہ مختصر دین ودنیا میں ان کا بول بالا تھا، دین تھا توان کا، دنیا تھی توان کی، مگر جب سے تنزل کے میدان میں انہوں نے قدم رکھا ہے، چاروں طرف سے ادبار نے گھیر لیا ہے۔ ساری کمائی لٹ گئی، دنیا میں صرف ان کا نام ہی نام رہ گیا اور ان کے گھر کی دولت پر غیر قومیں قابض ہوگئیں۔ علماء گوشہ نشین ہوگئے۔ غرباء بھیک مانگنے لگے، یہاں تک کہ غیر قوموں کو بھی ان کی ابتری پر ترس آنے لگا۔ ایسی حالت میں کیونکر امید کی جاسکتی ہے کہ قوم کا خزاں رسیدہ باغ سرسبز وشاداب ہوکر لہلہانے لگے۔ بجز اس کے کہ قومی جوش از سرنو پیدا ہو۔ اور ہر ہر فرد پست ہمتی اور ضرورتوں کو چھوڑ کر اولوالعزمی اور حوصلہ مندی پر صبر واستقلال کے ساتھ آمادہ ہوجائے۔

امت کی اصلاح

امت میں اصلاح حال کی کوئی کوشش حقیقی طور پر اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتی جب

تک علماء اس کے داعی اور علمبر دار نہ بنیں اور ان میں امت کی رہنمائی وقیادت کی صلاحیت پیدا نہ ہو، اس کے لیے ایک طرف دینی علوم پر حاوی اور کتاب و سنت کا رمز شناس ہونے کی ضرورت ہے۔ دوسری طرف حالات زمانہ اور جدید ضرورتوں سے واقفیت کی۔

دین و دنیا کی ہم آہنگی و رفاقت

قدیم و جدید اور دین و دنیا کی ہم آہنگی اور رفاقت اصولی و نظری حیثیت سے خواہ کتنی ہی ضروری اور اسلام کی جامعیت وہدایت کے لحاظ سے خواہ کتنی ہی قابل عمل اور ممکن ہو، ایک ایسا نازک کام ہے جس کے لیے غیر معمولی احتیاطوں کی ضرورت ہے۔ کسی ایک پہلو کا پلڑا ذرا سا بھاری ہو، اور کسی ایک پہلو سے ذرا سا اغماض برتا جائے تو دوسرا مقابل پہلو آسانی کے ساتھ دوسرے پہلو کو دبا لیتا ہے۔ اور جیسا کہ فطرت انسانی اور جماعت انسانی کا ہمیشہ سے دستور رہا ہے، غالب مغلوب کے ساتھ اور فاتح مفتوح کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کرتا، ایک ایسے زمانہ میں یہ عمل اور بھی دشوار ہو جاتا ہے جب جدید علوم اور مادی ترقی کی پشت پر ایک مضبوط اور صاحب اقبال حکومت، ایک جواں سال اور نوخیز تہذیب، جدید علوم وفنون اور مادی ترغیبات کا پورا لشکر ہو۔ اور طبیعتوں کے اندر خود ان کا اثر قبول کرنے کی پر زور خواہش اور بے پایاں جذبہ پایا جاتا ہو، اس وقت قدیم تعلیم اور دینی جذبات کو ان کا اصل مقام عطا کرنے اور ان کی گرفت قائم رکھنے کے لیے غیر معمولی روحانیت، کیمیا اثر صحبت اور نفس گرم اور قلب بے تاب کی ضرورت ہے۔ ورنہ اس عالم اسباب میں جدید کا قدیم پر اور دنیا کی دین پر فتح پالینا قانون فطرت اور تقاضائے عقل ہے۔

اسی طرح حریت فکر کی دعوت اور تنقید واحتساب کا کام بھی اتنا ہی نازک اور پیچیدہ ہے کہ اگر اس کے ساتھ سلف اور پیشروؤں کی عظمت، ان سے محبت اعلیٰ درجہ کی استقامت، عمل و عبادت کا جذبہ اور ذوق اور غایت درجہ کی تواضع وانکسار نہ ہو تو اس عمل (تنقید و احتساب) اور

اس دعوت حریت فکر کے ساتھ ایسے مفاسد اٹھ کھڑے ہوتے ہیں جو بعض اوقات ذہنی بغاوت وانارکی یا کم سے کم بے عملی و تعطل تک پہنچا دیتے ہیں۔اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اسلام کی فکری و اصلاحی تاریخ میں اس فریضہ کے انجام دینے والے اگر متقی زاہد و عابد اور صاحب باطن و صاحب نسبت تھے تو باوجود اس کے کہ انہوں نے عمل جراحی کا پورا فرض انجام دیا اور انہوں نے پوری جرأت و بیباکی کے ساتھ تنقید و تنقیح اور جرح و تعدیل کا کام کیا، لیکن ان سے ان کے زمانہ میں یا ان کے بعد کے زمانہ میں تشکک وارتیاب کی کوئی لہر پیدا ہوئی، نہ طبیعتوں میں بے قیدی و آزادی آئی۔نہ عمل و عبادت کا جذبہ سرد ہوا، نہ ان کے معتقدین میں فرائض سے غفلت اور تساہل پایا گیا۔

آگ پر تیل

یہ قاعدہ ہے کہ جب طبیعتوں میں بے اعتمادی پائی جاتی ہے اور ذہنی اختلاف ہوتا ہے تو کوئی ایک واقعہ آگ پر تیل کا کام دیتا ہے۔

شجر سے پیوستہ رہ امید بہار رکھ

فرع کا اپنی اصل سے اور وارث کا اپنے مورث سے منقطع ہوجانا کوئی خوشگوار اور خوش آئند واقعہ نہیں بلکہ بہت کچھ بے برکتی کا موجب ہے۔

لافانی

کسی مقصدِ عالی کے حصول میں مخلصانہ اتحاد عمل دلوں میں وہ ربط و تعلق پیدا کر دیتا ہے جس کو موت بھی فنا نہیں کر سکتی۔

سب سے بہتر

کوئی شخص کتنا ہی بڑا عالم و فاضل، مصنف و مفکر، سیاسی رہنما یا دین و ملت کا خادم ہو، اسلامی نقطۂ نظر سے اس کی عائلی و معاشرتی زندگی اس کے اپنے اہل و عیال اور گھر والوں کے ساتھ اخلاق و تعلقات، اس کے متعلق ان کا تاثر و شہادت بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اور خواہ کوئی شخص اپنے اجتماعی و ملی مقاصد کی تکمیل میں کتنا ہی استغراق رکھتا ہو، اس کی ذاتی اور گھریلو زندگی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں، بلکہ در حقیقت اس کے کامل انسان اور مثالی مسلمان ہونے کا یہی معیار و میزان ہے۔ اس لیے کہ حدیث میں آیا ہے: «خیر کم لأهله وأنا خیرکم لأهلي» "تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں کو کیلئے بہتر ہو اور میں اپنے گھر والوں کے لیے تم میں سب سے بہتر ہوں"۔

دو زرّیں اصول

(۱) دوسروں کے جذبات کا لحاظ رکھنا اور ان کے اختیارات میں دخل نہ دینا۔

(۲) اپنے اختیارات کے حدود میں بھی دوسرے معتمدین یا ارکان کونسل سے مشورہ لینا۔

سب سے بڑا عیب

اس زمانہ میں سب سے بڑا عیب جو ہم مسلمانوں میں پیدا ہو گیا ہے وہ یہ ہے کہ نیکی کرنے کا خیال دلوں سے اٹھ گیا ہے۔ ہمارا کوئی کام خود غرضی سے خالی نہیں ہوتا، طمع و حرص کی ترغیبوں نے ہم کو مغلوب کر دیا ہے۔ جھگڑوں کا طوفان موجزن ہے، بھائیوں کی سبکی سے خوشیاں منائی جاتی ہیں، تنگدستی نے حواس کو ایسا مختل کر دیا ہے کہ نہ اپنی ہستی سوجھتی ہے نہ دوسروں کی حالت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ہمارے حرکات و سکنات پر خود غرضی فرمانروا ہے، قوم کو ملک کو، وضع کو، غرض جو کچھ ہم کو مل سکے اس کو اپنی غرض پر قربان کرنے کو ہر وقت ہم آمادہ رہتے ہیں۔

ہندوستان طلائی زنجیر

اسلامی تاریخ کا ہر شناسا اس حقیقت سے بخوبی واقف ہے کہ ہندوستان عالم اسلام کی طلائی زنجیر میں ایک اہم کڑی کی حیثیت رکھتا ہے، اور اسلامی افکار و علوم میں اپنا خصوصی کردار ادا کر چکا ہے۔ مولانا سید عبدالحیٔ الحسنی کی کتاب الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند پر ایک اجمالی نظر ڈالنے ہی سے اس دعویٰ کی تصدیق ہو جائے گی کہ اسلامی علوم و فنون کی خدمت میں ہندوستان کا حصہ کسی دوسرے ملک سے کم نہیں بلکہ بیشتر ممالک سے زیادہ ہے۔

عرب مؤرخین اور ہندوستانی مشاہیر

لیکن متعدّد وجوہ سے ہندوستان عرب مؤرخین کی نگاہوں سے پوشیدہ رہا۔ ایک بڑی وجہ تو یہ تھی کہ ہندوستان اس عالمی گزر گاہ سے الگ تھا جس سے علم و فن کے کاروان گزرتے تھے، دوسری وجہ یہ تھی کہ فارسی سرکاری زبان ہونے کی وجہ سے تالیف و تصنیف کی زبان بھی بن گئی تھی۔ خوش قسمتی سے حج کی تقریب سے علماء ہند کو عرب جانے کا موقع ملتا تھا۔ اور عقیدت کی کشش ان کو بار بار حجاز کھینچ لے جاتی تھی، بہت سے لوگ مستقل ہجرت کر کے وہاں سے مشائخ سے علوم خصوصاً حدیث میں استفادہ کرتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر حج کی تقریب نہ ہوتی تو عالم عربی کو بھی کسی کولمبس کی ضرورت ہوتی جو اس انوکھی دنیا کا پتہ لگاتا۔

اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ حافظ سخاوی نے اپنی مشہور کتاب الضوء اللامع میں جو نویں صدی کے علماء کے حالات پر مشتمل ہے۔ ہندوستان کے صرف (۸۸) اٹھاسی علماء کا ذکر کیا ہے۔ اور علامہ شوکانی یمنی نے ہندوستان سے قریب ہوتے ہوئے بھی البدر الطالع میں ساتویں صدی سے لے کر بارہویں صدی تک ہندوستانی علماء میں صرف سات کا ذکر کیا ہے۔ محبی نے خلاصۃ الاثر میں گیارہویں صدی کے علماء ہند میں سے (۱۴) چودہ کا تذکرہ کیا ہے۔ حالانکہ ان کی کتاب میں جن شخصیات کا تذکرہ آیا ہے ان کی تعداد بارہ سو نوے (۱۲۹۰) ہے اسی طرح مرادی

نے سلک الدرر میں بارہویں صدی کے صرف سات (۷) علماء کا تذکرہ لکھا ہے۔

مؤرخ کی صحیح کامیابی

ایک مؤرخ کی صحیح کامیابی کا پیمانہ اور اس بات کی شہادت کہ اس کو اپنے فن میں کس درجہ کا ملکہ خداداد حاصل ہے اور وہ اس کوچہ کی رسم وراہ سے کہاں تک آگاہ ہے۔ یہ نہیں ہے کہ اس نے کتنے صفحات سیاہ کیے اور کتنی ضخیم تصنیف اس نے تیار کردی اس کا راز دراصل اس کے جزئیات و معلومات کے انتخاب اور اس رد و قبول میں پوشیدہ ہوتا ہے جس سے اس نے اپنی تصنیف میں کام لیا ہے۔

انسان معصوم نہیں

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ پیغمبروں کے سوا کوئی انسان معصوم اور سرتاپا مجموعہ خوبی نہیں۔ بڑی سے بڑی علمی و دینی شخصیت میں کچھ مزاجی خصوصیات اور کچھ انسانی کمزوریاں ضرور پائی جاتی ہیں کوئی مغلوب الغضب ہوتا ہے، کسی میں ضرورت سے زیادہ احساس برتری کسی میں خودرائی و مطلق العنانی ہوتی ہے، کوئی اپنے باکمال معاصرین کے اعتراف سے گریز کرتا ہے کسی میں خوشامد پسندی، کوئی اس علمی شہرت کا مستحق نہیں ہوتا، کوتاہ نظر معاصرین یا غالی عقید تمندوں نے اس کو عطا کر رکھی ہے وغیرہ وغیرہ۔

مردے از غیب بیروں آید و کارے کند

ہندوستان کے ہمسایہ اسلامی ممالک افغانستان و ایران بڑے مردم خیز ملک واقع ہوئے ہیں۔ جن کی زمین سے ہزارہا اہل فضل و کمال اٹھے۔ اور ایران کو تو دنیائے اسلام کا یونان کہنا صحیح ہوگا۔ لیکن ان میں سے کوئی ملک اپنے علماء و اہل فضل کا کوئی ایسا (نزھۃ الخواطر جیسا) مکمل و مسلسل تذکرہ پیش نہیں کر سکتا، دور افتادہ ممالک میں ترکی نے چار سو (۴۰۰) برس تک عالم اسلام

کی قیادت کی ہے اور قسطنطنیہ مسلمانوں کا دار الخلافہ رہا ہے۔ اور وہاں بھی ہزاروں کی تعداد میں علماء و مصنفین و مدرسین پیدا ہوئے، لیکن وہاں بھی کسی عالم و مصنف نے ایسا کوئی تذکرہ مرتب کرنے کی زحمت گوارہ نہیں کی جو اس لائق صد احترام ملک کے مکانی و زمانی رقبہ پر محیط ہو۔

علم و تحقیق کو بس نہیں

علم و فن فلسفہ و حکمت، شعر و ادب، صناعی و معماری مصوری و نقاشی، اختراعُ و ایجاد سب کی وسعت و ترقی کا راز اسی نکتہ میں ہے کہ ان کے کسی نقش کو نقش دوام اور ان کی تحقیق کو حرف آخر قرار نہیں دیا گیا۔ اور حوصلہ مند مصنفین اور نیک نیت ماہرین فن اور علم و تحقیق کی سچی لگن رکھنے والے اہل قلم نے اپنے پیشروؤں کے فضل و کمال اور ان کی اولیت کا اعتراف کرتے ہوئے ان کا علمی محاسبہ بھی کیا۔ اور تحقیق کا ایک قدم آگے بڑھانے اور ان کے معلومات کے اندوختہ میں اضافہ کرنے کی جرأت کی، یہ دنیا کی کسی زبان اور کسی علم و فن کی تاریخ میں کبھی بھی گناہ یا شوخی و گستاخی نہیں قرار دی گئی بلکہ ہر نئی نسل کے بساط علم و تحقیق کے تازہ واردوں کے کان میں ہمیشہ غیبی آواز آتی اور ان کا دل بڑھاتی رہی۔

گماں مبرکہ بیاباں رسید کار مغاں
ہزار بادہ ناخوردہ در رگِ تاک است

تنقید مگر کیسے ؟

کسی تصنیفی کاوش کو اس زمانہ کے حدود، ماحول اور مصنف کے مقرر کیے ہُوئے پیمانہ اور اس کے تصنیفی منصوبہ سے علیحدہ کر کے کسی دوسرے زمانہ کے حدود و ماحول میں رکھ کر اس زمانہ کے معیاروں اصطلاحوں اور مقرر کردہ اصولوں سے جانچنا اور ناپنا صحیح نہیں ہوتا۔

علمی ترقی و بلند ہمتی

علمی ترقی و بلند ہمتی کے ساتھ اکتساب فیض کے لیے دور جاکر اور اجنبی ماحول میں رہ کر علم کی تحصیل ہمیشہ سے مفید ثابت ہوئی ہے۔ اسی لیے سفر ہماری علمی و تعلیمی تاریخ کا ایک نہایت روشن اور ضروری عنوان رہا ہے اور عام طور پر انہی لوگوں نے علمی و عملی کمالات حاصل کیے ہیں۔ جنہوں نے طویل طویل سفر اختیار کر کے نامور علماء و اساتذہ سے کسبِ فیض کیا۔

علم

مطلق علم ایک صفتِ مستحسن ہے۔ اسی طرح تمام علوم طبع سلیم کو مرغوب ہیں۔ لیکن ان میں سے بعض عملی حیثیت سے انسانی کی جسمانی و مادی ترقی کے لیے ضروری ہیں۔ اور بعض روحانی ترقی اور تزکیہ باطن کے لیے اور بعض تنشیط ذہن و تفریح طبع کے لئے، تحصیل علوم کے احکام نیت پر موقوف ہیں۔ لیکن جو عام تزکیہ باطن کے لیے ضروری ہیں۔ مثلاً علوم قرآن حدیث و سیرت ان سے بہرحال شغل رکھنا ضروری ہے جن حالات میں استعداد کی اہمیت بھی بڑھ جائے گی۔ انہیں حالات میں ان علوم کی اہمیت بھی بڑھ جائے گی، جن پر استعداد موقوف ہے مثلاً کیمیا اور ریاضی و طبعیات والسنہ و تاریخ و اقتصاد و صناعات وغیرہ۔ استعداد فرض کفایہ ہے، اس لیے ان علوم کی تحصیل بھی فرض کفایہ ہو جائے گی اور جب تک ان علوم کے ماہروں کی تعداد کفایت کی حد تک پہنچ جائے تمام افراد پر اس کا بار رہے گا۔ تیسری قسم کے علوم مثلاً ادب و شعر بھی بعض وقت موکد ہو جاتے ہیں، اور بعض وقت مکروہ، جب باعث اضاعت وقت ہو جائیں تو مکروہ ہو جائیں گے، اور جب ان سے فرائض و موکدات کیلیئے ذہن کو تیار کرنے کا کام لیا جائے تو موکد ہو جائیں گے۔

آں کس کہ

آں کس کہ ترا شناخت جاں را چہ کند
فرزند و عزیز و خانماں را چہ کند
دیوانہ کنی ہر دو جہانش بخشی
دیوانہ تو ہر دو جہاں را چہ کند

ولایت کی تعریف

ولایت اسی کو کہتے ہیں کہ احکام شریعت بے تکلف ہونے لگیں اور افعال شریعت ایسے ہو جائیں کہ گویا امور طبعی ہیں۔

حدیث پڑھنے میں توجہ الٰہی

ایک محدث صاحب تشریف لائے تو حضرت قبلہ (فضل الرحمن گنج مرادآبادی) نے فرمایا کہ تم جانتے ہو کہ حدیث پڑھنے میں اللہ کو کیسی محبت ہوتی ہے، اور کیسا پیار ہوتا ہے، جیسے کسی عورت کا لڑکا مر جائے اور اس کی کوئی کتاب پڑھنے کی ہو، اور اس لڑکے کے مرنے کے بعد اس کی ماں کسی طالبعلم کو دے کہ یہ میرے لڑکے کی کتاب ہے۔ اس کو پڑھو اور ہم کو سناؤ، اب اس وقت پڑھنے میں جو کیفیت اور جوش محبت اس کی ماں کو ہوتا ہے ویسا ہی بعد رسول کے، ان کی حدیث پڑھوانے سے ایک محبت کا جوش اللہ تعالیٰ کو ہوتا ہے۔

حدیث کا فیضان

ایک بار آپ نے حدیث کے فیضان کو فرمایا کہ شیخ عبدالحق محدث جہاں حدیث پڑھاتے تھے۔ ایک بزرگ نے دیکھا کہ وہاں انوار آسمان سے زمین تک نازل ہو رہے ہیں۔ دریافت کیا تو

معلوم ہوا کہ یہاں درس حدیث ہوتا تھا، اب وہاں گنوار رہتے ہیں۔

زہد و توکل کا لازمی نتیجہ

زہد و توکل کا طبعی و لازمی نتیجہ بذل و عطا اور جود و سخا ہے جس صاحب یقین پر دنیا اور دولت کی حقیقت منکشف ہو جاتی ہے اور قل متاع الدنیا قلیل کا استحضار ہو جاتا ہے وہ بخل کے ہر شائبہ سے پاک ہو جاتا ہے جس کو اشرفیاں سٹکیاں اور ٹھیکریاں نظر آنے لگتی ہیں اور مال کی محبت دل کے ہر گوشہ سے نکل جاتی ہے، اس کا ہاتھ کون روک سکتا ہے۔

شرفاء و غرباء کی مدد کا طریقہ

راقم سطور (علامہ ندوی) نے نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خان شیروانی مرحوم سے خود سنا کہ ایک بار سر شام کسی نے پانچ سو (۵۰۰) روپیہ نذر کئے۔ اسی وقت اعلان فرمادیا کہ ہمارے حجرہ کی دیوار گری جارہی ہے اس کی مرمت کی ضرورت ہے۔ اہل قصبہ اس ادا سے واقف تھے بہت سے شرفاء اور غرباء ٹوکریاں اور پھاوڑے وغیرہ لے کر حاضر ہوگئے اور کسی نے دیوار کو ہاتھ لگایا، کسی نے کچھ کیا۔ آپ نے کسی کو کچھ دیا، کسی کو کچھ سونے سے پہلے ساری رقم تقسیم فرما کر فارغ ہوگئے۔ کسی صاحب نے عرض کیا کہ آخر ایسی کی عجلت تھی۔ فرمایا واہ ہماری دیوار گری جارہی تھی، تم باتیں بناتے ہو۔

اہل حکومت و وجاہت کی بے وقعتی

جس اللہ کے بندے پر اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی منکشف ہو جاتی ہے اور اہل دنیا اور ان کے مال و دولت سے وہ اپنی امید منقطع کر لیتا ہے، اور بے طمع ہو جاتا ہے اس کی نگاہ میں اہل حکومت اور اہل ثروت کی عظمت اور اس کے دل پر ان کا رعب نہیں رہتا اور بعض اوقات بڑے بڑے اہل جاہ اور ارباب حکومت اس کو مور و مگس کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔

صلحائے امت کا مرتبہ

اس حالت کیف میں فرمایا کہ امتیان محمدی میں سے بہت ایسے لوگ ہیں کہ حوریں ان کی مشتاق ہیں۔ جب وہ جنت میں بلا حساب وکتاب جائیں گے تو حوریں ان کو دیکھنے کو دوڑیں گی اور وہ محو تجلیات کبریائی ہوں گے۔ دوزخ کی طرف سے ہوکر گزریں گے تو دوزخ ان سے پناہ مانگے گی اور ان کے چہرے مثل ماہتاب کے درخشاں ہوں گے۔

معمہ حل نہیں ہوسکتا

کسی فن کا آدمی ہو جب تک خود ہم کو اس میں مداخلت نہ ہو ہم نہیں جانتے وہ کیسا ہے، کامل یا ناقص، استاد یا اناڑی، اگر ہم اصول اقلیدس سے واقف نہیں تو اگر ایک شخص کسی شکل کی مشق کو حل کرے تو ہم یہی کہیں گے کہ کچھ لکیریں کارتا ہے، اس کا کیا نفع ہے یا اس کا حل کس ذہن و دماغ کا کام ہے۔ یہ ہماری سمجھ سے باہر ہے، ایسا ہی کچھ تصوف کا حال ہے۔ جب تک ہم صاحب حال نہ ہوں یہ معمہ حل نہیں ہوسکتا اور یہ مطلب صاف ہونا ممکن نہیں ہے۔

ایک تلخ تاریخی حقیقت

یہ ایک تلخ تاریخی حقیقت ہے کہ بہت سی تاریخ ساز عہد آفریں اور نادرہ روزگار شخصیات ایسی بھی ہیں جن کی مکمل سیرت (جو ان کی روشن ترین خصوصیات پر حاوی اور ان کے مرکزی اور اہم کمالات و محاسن پر روشنی ڈالتی ہو) عرصہ دراز تک مرتب نہیں ہوئی۔ اور یہ بات ان کے ماننے والوں اور عقید تمندوں پر ایک اخلاقی و دینی و علمی قرض کی نوعیت رکھتی ہے جس کی ادائیگی بعض اوقات انہوں نے بھی نہیں کی جو ان کی تعلیم میں غلو اور مبالغہ سے کام لیتے اور ان سے محبت و وابستگی کو سرمایہ ایمان و آگہی سمجھتے ہیں، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ یہ قرض ماہ و سال کی مختصر مدت میں ادا ہوجاتا ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ صدیاں بیت جاتی ہیں، نسلیں ختم ہوجاتی ہیں اور ان

کے ادائے حقوق سے سبکدوش کی نوبت نہیں آتی۔

یہ صورت حال کسی ایک فرد یا کسی ایک زمانہ کے ساتھ مخصوص نہیں، انسانیت کے کتنے ایسے رہنما کہ، اصلاحی تحریکات کے علمبردار، ملکوں اور قوموں کے محسن و معمار اور علم و حکمت میں مجددانہ و مجتہدانہ شان رکھنے والے باکمال گزرے ہیں، جن کے کمالات و خصوصیات سے دنیا عرصہ تک بے خبر رہی اور ان کے نام تاریخ کے ملبہ کے نیچے صدیوں دبے رہے۔ چند مبالغہ آمیز داستانیں ان کے بارے میں علم و آگہی کا سرمایہ اور "سدرۃ المنتہیٰ" ہوتا ہے اور اسی چوکھٹہ میں ان کی شخصیت کو محصور کر دیا جاتا ہے۔ بسا اوقات چند ضمنی طور پر پیش آنے والے حوادث اور کچھ سیاسی مصالح واختلافات حق وانصاف کے تقاضے پورا نہیں کرنے دیتے، ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض مخصوص عقائد کے حاملین ان کی شخصیت پر اجارہ داری قائم کر لیتے اور ان کے گرد اپنے جذبات و تصورات کا حصار قائم کر دیتے ہیں۔ ضرورت تھی کہ ان کی سیرت اس طرح پیش کی جاتی جس سے ان کے صحیح مقام سے دنیا آگاہ ہوتی، ان کی سیرت نسلِ انسانی کے لیے یا کم از کم اس دین کے متبعین کے لیے (جس کے وہ پیرو اور خادم تھے) ایک مثالی کردار کے طور پر سامنے آتی، ان کو اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم بخشش و نعمت سمجھا جاتا، رسول اللہ ﷺ کی تربیت کا ثمرہ، آپ کا ایک مستقل معجزہ، اسلام کی صداقت کی دلیل و حجت تصور کیا جاتا، اور اس بات کا ناقابل انکار ثبوت کہ اسلام میں ایسے مردانِ کار اور نوادرِ روزگار پیدا کرنے کی لافانی صلاحیت ہے، اس کے برخلاف دیکھا یہ گیا ہے کہ ایک تنگ و سنگین حصار ان کی زندگیوں کے گرد قائم کر دیا گیا، جو اس ماہ درخشاں کے لیے ایک ہالہ کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کو علم و تحقیق کا آخری درجہ دے دیا گیا، ان حدود سے نکل کر آزادانہ تحقیق اور حق وانصاف کے تقاضے کو پورا کرنا ایک مذموم بدعت و جدت اور راسخ الاعتقادی کے خلاف بغاوت کے مرادف قرار دیا گیا۔

فن تاریخ ایک منہدم قصر!

فن تاریخ کا جہاں تک تعلق ہے، اس کا اندازہ اس کا عملی تجربہ رکھنے والے مصنف ومحقق کو ہوگا کہ اس کی مثال ایک منہدم قصر کی ہے۔ جو کھنڈر کی شکل میں ہو، اس کے ملبہ کے نیچے وہ سب کچھ مل سکتا ہے جس کی کسی طالب صادق اور جویائے حق کو ضرورت پڑ سکتی ہے کہیں مٹی کے برتن اور روزہ مرہ کے استعمال کی چیزیں ہوں گی، کہیں پر ساز شکستہ اور کتابوں کے اوراق دریدہ ہوں گے۔ کسی جگہ پر زیورات و جواہرات بکھرے اور دبے ہوئے ملیں گے، کہیں وہ ستون نظر آئیں گے جن پر قصر کی پوری عمارت قائم تھی، کہیں محرابیں ہوں گی جو زبانِ حال سے ایوانِ شاہی کے دورِ رفتہ کی داستانِ شوکت وعظمت سنا رہی ہوں گی، وہ شخص جو خود اس ملبہ کے نیچے دبے ہوئے آثار کو تلاش نہیں کرتا بلکہ دوسروں کے تراش کردہ اثاثہ پر اعتماد کرتا ہے اور اس زمانہ کی تصویر دیکھنا چاہتا ہے، جب قصر آباد تھا، ہر شے اپنی جگہ پر تھی، قصر جمال و شکوہ کا آئینہ دار تھا، وہ تاریخ کا حق ادا نہیں کر سکتا اور کھنڈر سے وہ جواہرات نہیں برآمد کر سکتا جن سے قصر کے نقش و نگار اور آرائش و جمال کا صحیح اندازہ ہو سکے۔

ہر مؤرخ کا مخصوص انداز

یہ بھی واقعہ ہے کہ ہر رہنما مؤرخ اپنا ایک مخصوص انداز بیان رکھتا ہے اس کا اپنا ذوق و ذہن ہوتا ہے، اس کے اپنے عقائد اور سیاسی رجحانات ہوتے ہیں، جن کے حصار سے اس کا نکلنا مشکل ہوتا ہے، اس کے سامنے اگرچہ ایک وسیع کتب خانہ کے مختلف شعبے (ڈپارٹمنٹ) ہوتے ہیں۔ مگر وہ کسی ایک شعبہ کو اپنی نظر میں رکھ کر اپنی یادداشت یا مطالعہ کا حاصل جمع کر دیتا ہے۔ آنے والے اس کے ذوق و ذہن کے ثمرہ کو اسوہ یا نمونہ بنا کر تاریخ کے میدان میں خامہ فرسائی کرنے لگتے ہیں، اور اس گزرے ہوئے کارواں کے نقشِ قدم پر اپنا سفر جاری رکھتے ہیں۔ لیکن جیسا کہ قدماء نے کہا ہے "کم ترك الأول للآخر" گزرنے والوں نے آنے والوں کے لیے

بہت کچھ چھوڑ رکھا ہے "فن تاریخ کو آج بھی ایک آبلہ پا کی تلاش ہے جو اس خارزار میں داخل ہو کر گل چینی پھر گل ریزی کرے اور اس کے کان میں کوئی یہ کہہ کر ہمت بندھا رہا ہو۔

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کار مغاں
ہزار بادہ ناخوردہ در رگِ تاکست

عبقری شخصیت کی سوانح

ایک ایسی اولوالعزم نادرہ روزگار عبقری شخصیت پر قلم اٹھانا آسان نہیں جس کی اصل شخصیت افراط وتفریط اور اختلافات کے پردوں کے پیچھے پوشیدہ ہو، اور جس کو ہر فریق نے اپنی خاص عینک سے اپنے افکار و نظریات اور روایتی عقائد کے آئینہ میں دیکھا ہو۔ یہاں تک کہ پوری زندگی چند متضاد خیالات وتصورات کا مجموعہ بن گئی ہو، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو نام تو ایک ہے مگر شخصیتیں متعدد بلکہ متضاد ہیں۔ اصل شخصیت اور اس کی عبقریت اب بھی نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔

قریش کی امتیازی خصوصیات

قریش کی امتیازی خصوصیات میں یہ بات بھی تھی کہ وہ اپنی اولاد سے محبت رکھتے تھے (بدویانہ معاشرت میں یہ بات نہ تھی) خانہ کعبہ کا طواف کرتے تھے، مناسک حج ادا کرتے تھے، میت کو کفن پہناتے، غسل جنابت کرتے، ہندوستان یا ایران کی طرح ان میں برہمنوں یا آتش کدہ کے خاندانی منتظموں کی طرح پروہتوں کا کوئی طبقہ نہیں پایا جاتا تھا۔ اور وہ اس سے دور تھے۔ شادی بیاہ ذرا دور کی قرابت میں کرتے اور نکاح میں گواہوں اور مہر کا التزام رکھتے، طلاق دیتے تو تین بار دیتے، بیٹی نواسی، بہن اور بھانجی سے اس وقت کے ایرانی مجوسیوں کی طرح مناکحت نہیں کرتے تھے، بلکہ اس کو عار اور شرم وبے حیائی کی بات سمجھتے تھے۔ قرآن نے ان کے اس طرزِ معاشرت کو بہ نظرِ استحسان دیکھا، اور اس کی کئی چیزوں کو قائم رکھا۔

قریش کی امتیازی شان میں اضافہ کرنے والی ایک خصوصیت یہ تھی کہ یہ لوگ جس قبیلہ میں چاہتے شادی کر سکتے تھے، مگر ایک شرط ضرور کر لیتے کہ جس سے شادی کی جارہی ہے، مذہب کے معاملہ میں اس کے اندر پختگی اور گہرائی ہو۔ ان کا عقیدہ تھا یہ جائز ہی نہیں ہے اور نہ ان کے خاندان روایات کے شایان شان ہے کہ ایسے شخص سے مناکحت کا تعلق پیدا کریں جو عقیدہ میں ان کا ہم مشرب نہ ہو اور یہی نہیں بلکہ اس کے اندر مذہبی حمیت اور جوش بھی ہو۔

ایک انتہائی نازک اور فیصلہ کن گھڑی

رسول اللہ ﷺ کی وفات اس امت کی موت وحیات کا فیصلہ کرنے کے لیے نازک ترین گھڑی اور آزمائش تھی۔ اسلام اس وقت تک ایک چھوٹے سے جزیرہ کی حیثیت رکھتا تھا جس کی گرد جاہلیت، مشرکانہ عقائد، حیوانی عادات وخصائل وحشیانہ طرزِ زندگی بگڑے ہوئے نظام حیات اور ظالم و جابر حکومتوں کا ایک سمندر موج زن تھا۔ عرب نئے نئے اسلام لائے تھے، ان کو اپنی قدیم قبائلی زندگی میں اتحاد و یگانگت کے ساتھ کام کرنے کی اور کسی نظام کا پابند ہو کر زندگی گزارنے کی عادت نہیں تھی۔

دنیا کے وہ عظیم مذاہب جن کا اپنے اپنے زمانہ میں دور دورہ تھا جن کے ماننے والے روئے زمین کے وسیع رقبوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ بے شمار قومیں اور انسانی آبادیاں ان کا کلمہ پڑھتی تھیں، وہ مذاہب آغاز تاریخ ہی میں بے راہ روی (انحراف) اور دین کے اصول میں تغیر و تبدل (تحریف) کا شکار اور اندرونی سازشوں اور بیرونی مخالفتوں کے اثر سے نیم جان اور بے روح بن چکے تھے۔

اس کا سبب صرف یہ تھا کہ ان مذاہب کے اولین پیشواؤں اور ذمہ داروں کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد ہی ان کی قائم مقامی اور ترجمانی ان اشخاص کے حصہ میں آئی جو ان مذاہب و ادیان کے مقاصد و تعلیمات کے فہم میں وہ گہرائی نہیں رکھتے تھے یا ان کے بارہ میں وہ

اخلاص وعزم ان میں نہیں پایا جاتا تھا۔ جو پیغمبروں اور داعیان ادیان کے نائبین اولین کے لیے ضروری ہے۔ ان کے اندر ان ادیان اور تعلیمات کی اصلیت باقی رکھنے کیلئے اس درجہ کی غیرت و حمیت اور فکر مندی بھی نہیں تھی۔ جس کی اس مرحلہ پر ضرورت ہوتی ہے۔ وہ دنیا طلبی میں بھی کسی سے پیچھے نہیں تھے اور ان میں سے اکثر جاہ ومنصب پر فریفتہ تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ مذاہب ان فلسفوں اور رواجی طریقوں کے اندر جذب ہو گئے جن کو یہ مذاہب نیست و نابود کرنے کے لیے وجود میں آئے تھے، اور ایسا بھی ہوا کہ ان مذاہب نے زمانہ کی رو سے مصالحت کرلی اور ان کا پیوند بن گئے تاکہ مذہب ان حکمرانوں کی خواہشات کی تکمیل کر سکے جنہوں نے اس کو قبول کیا تھا۔ ان حکمرانوں اور ان حکومتوں نے مذاہب کا استحصال زیادہ کیا اور فائدہ کم پہنچایا، یہ وہ صورت حال ہے جس سے برہمنیت، بدھ مت زرتشت مذہب کو اپنے بانیوں کے تھوڑے ہی عرصہ بعد سابقہ پڑا۔ یہودیت بھی بہت جلد اس دامِ تحریف و تزویر میں گرفتار ہوگئی اور حضرت سیدنا مسیح علیہ السلام کی مفارقت کے بعد جلد ہی نصرانیت کو بھی اس سازش اور خطرہ سے دوچار ہونا پڑا۔

بہت سی تحریکیں

جن لوگوں نے انقلابی تحریکوں اور دعوتی کوششوں کی تاریخیں پڑھی ہیں، ان کو اندازہ ہو گا کہ بہت سی تحریکیں شروع تو ہوئیں خالص دین اور اصلاح کے لیے مگر ان کی انتہا ہوئی ایک خاندان یا گھرانہ کے لیے، جاہ وجلال حکومت وسلطنت کے حصول پر، یا سیاسی وفوجی قسم کا نفوذ حاصل کرنے پر یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ جن کا دینی حاسہ قوی ہے اور جن کو اللہ نے فہم وبصیرت عطا کی وہ اس طرح کی تحریکوں سے مشکوک اور خائف رہتے ہیں کہ معلوم نہیں کہ ان کا کیا انجام ہو گا۔

گھر میں آپ کا پہلا اور آخری کام

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی سفر پر روانہ ہونے لگتے تو آخری کام جو کرتے یہ ہوتا کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے ملتے اور جب واپس آتے تو پہلا کام یہ ہوتا کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو جا کر دیکھتے۔

ابوبکر رضی اللہ عنہ سرولیم میور کی نظر میں

سرولیم میور اپنی مشہور کتاب (تاریخ خلافت اولیٰ) میں لکھتے ہیں:

''ابوبکر کے دربار کی سادگی کا وہی عالم تھا جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں تھا۔ نہ خدّام تھے، اور نہ محافظ اور نہ حکومت کی شان و شوکت ظاہر کرنے والی کوئی اور شے۔ ابوبکر محنت کے عادی تھے، اور ایسے بہت سے واقعات ملتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ معاملات کی جزئیات پر بھی نظر رکھتے تھے۔ راتوں کو وہ مظلوموں اور غرباء کی تلاش میں گھومتے رہتے۔ حکومت کے عمال اور اعلیٰ حکام کو تعینات کرنے میں کنبہ پروری یا طرف داری سے بالاتر تھے۔ اور ان کے کردار سے عقل و دانش کا اظہار ہوتا ہے۔''

وہ ہمارے آباء

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے بعض عاملوں کو جو عجمی ممالک میں تعینات تھے لکھا:

''عیش پسندی اور اہل عجم کے لباس نہ اختیار کرنا، دھوپ میں چلنا اور کام کرنا نہ چھوڑنا، یہ عربوں کا حمام ہے۔ محنت کش اور فاقہ کش معاشرت کو اپنائے رکھنا، کھردرے اور چوبی بستروں کی عادت قائم رکھنا (یعنی نرم بچھونے گدے مخمل وغیرہ کے استعمال سے بچنا) موٹے جھوٹے پرانے کپڑوں پر گزر کرنا نیزے بھالے رکھنا نہ بھولنا،

گھوڑوں پر جست لگا کر بیٹھنا تیر اندازی اور نشانہ بازی کرتے رہنا"۔

باہم مثالی محبت

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک فرزند کا نام عمر رکھا۔ اور دوسرے کا نام ابوبکر اور تیسرے کا نام عثمان رکھا۔ عام طور سے لوگ اپنے فرزندوں کے نام انہی لوگوں کے نام پر رکھتے ہیں جن سے دلی تعلق ہوتا ہے اور جن کو مثالی انسان سمجھتے ہیں۔

انتقام کا جذبہ

انتقام کے جذبہ سے مغلوب قومیں جن کے ملک کو فتح کیا گیا ہے اور ایسے اہل ملک جن کو آزادی اور سلطنت سے ہاتھ دھونا پڑا ہے وہ جذبات انتقام سے مغلوب ہو کر فاتح قوم کے سربراہ پر حملہ کر دیتے ہیں۔

خطرناک چیز

قوموں اور معاشروں کی زندگی میں خلاء سے بڑھ کر کوئی چیز خطرناک اور مضرت رساں نہیں ہوتی۔ خاص طور پر جب مملکت یا معاشرہ خطرات سے گھرا ہوا ہو اور بڑے بڑے دشمن اس کی گھات میں ہوں۔

حیرت انگیز تاریخی حقیقت

استاد عباس محمود العقاد نے بڑی بلاغت اور نکتہ رسی کے ساتھ اس بات کا جائزہ لیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکروں میں کیا فرق تھا وہ کہتے ہیں:

"یہ ایک حیرت انگیز تاریخی حقیقت ہے کہ دونوں لشکر (جیشِ عراقی و جیش شامی) ایک دوسرے کی ضد تھے ایک طرف اجتماعی نظم و ضبط کی پسندیدگی اور اس کو باقی

رکھنے بلکہ مضبوط کرنے کی خواہش تھی دوسری طرف اجتماعی نظم سے چڑ نفرت اور نظم وضبط کے ڈھانچے کو توڑنے اور اس کے رخ بدلنے کے محرکات ودواعی جمع تھے"۔

عقاد مزید لکھتے ہیں

"پہلی قسم جو نظم وضبط کی خواہاں تھی وہ حضرت معاویہ کے حصہ میں آئی تھی۔ جو شام اور اس کے اطراف میں تھی، دوسری قسم جس کے اندر اجتماعی نظم وضبط سے گریز اور نفور تھا، وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حصہ میں آئی تھی۔ اس گروہ کا جغرافیائی ونسلی تعلق جزیرۃ العرب کے مختلف حصوں سے تھا"۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حکمت وبلاغت

مناسب ہوگا کہ نامور ادیب ونقاد الاستاد احمد حسن الزیات کی تاریخ الادب العربی سے ایک پیراگراف نقل کردیں جس میں وہ لکھتے ہیں:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد گزشتہ زمانوں میں یا بعد کی آنے والی نسلوں میں کوئی بھی علی سے زیادہ فصیح البیان ہمیں نظر نہیں آیا۔ خطابت میں بھی ایسا کوئی شخص نظر نہیں آیا جو ایسا زبان آور اور قادر الکلام ہو، وہ حکیم تھے، حکمت کے سوتے ان کے بیان سے پھوٹتے تھے وہ خطیب تھے بلاغت کا دریا ان کی زبان سے رواں تھا، واعظ تھے قلب ونگاہ پر چھا جانے والے رواں وشاداب قلم جن کے دلائل بڑے قوی وعمیق ہوتے تھے، کلام وبیان پر اس درجہ قدرت تھی کہ جس بات کو چاہتے اور جس طرح چاہتے ادا کرتے۔ اس پر سب کا اتفاق اور اجماع ہے کہ آپ مسلمانوں کے سب سے بڑے خطیب اور انشاء پردازوں کے امام تھے۔"

یہاں ہم عباس محمود العقاد کی رائے کا اضافہ کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں:

"امام سے جو پر شکوہ کلام مروی ہے، وہ ایک ایسا طرز ہے جس سے بلند کوئی دوسرا

طرز نہیں ہو سکتا، اس میں ضرب المثل فقروں کی حکمت کار فرما ہے اور ایک سے بڑھ کر ایک تعبیر ہے کہ عقل کو فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ کون سی تعبیر زیادہ افضل اور زیادہ طاقتور ہے معانی میں صداقت ادا میں بلاغت کی تعریف کی جائے یا فنی خوبیوں کو شمار کیا جائے۔"

یہ امر فراموش نہیں کرنا چاہیئے

یہ امر فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ حضرت معاویہ ابن ابی سفیان رضی اللہ عنہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کی جماعت کے ایک ممتاز فرد ہیں، ان کے مناقب میں حدیثیں وارد ہوئی ہیں، جو لوگ ان پر زبان طعن دراز کرتے ہیں اور ان کے سلسلہ میں بے باکی و زبان درازی سے کام لیتے ہیں ان کو اس امر کا پاس و لحاظ ہونا چاہیے کہ وہ ایک ایسے صحابی ہیں جن کو قرابت کا شرف بھی حاصل ہے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ، کاتبِ وحی

یہ بات ثابت ہے کہ حضرت معاویہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا کاتب بنایا تھا اور آپ کاتب اسی کو بناتے تھے جو عدل و امانت کے صفات سے متصف ہو۔

ہر جگہ اور ہر حالت میں

حالات ماحول، زمان و مکان جن میں حوادث پیش آتے ہیں وہ اپنے اندر ایک خاص ڈگری کی گرمی یا سردی رکھتے ہیں، اور حالات و ماحول اور وقت کی نزاکت اور حالات کی شدت کو دیکھ کر انسان کسی فیصلہ پر پہنچتا ہے اور وقت کے تقاضے کو پورا کرتا ہے۔ ہر جگہ اور ہر حالت میں ایک ہی عمل روا نہیں رکھا جاسکتا۔

شیروں کا مخزن

افغانستان اسلامی تاریخ کے ہر دور میں بہادروں اور شہسواروں کا مرکز، شیروں کا مخزن، فاتحین اور سورماؤں ... کا مولد و منشا اور اسلام کا مضبوط قلعہ رہا ہے۔ غالبًا یہی وجہ ہے کہ امیر البیان امیر شکیب ارسلان اس ملک کا تذکرہ لکھنے بیٹھے تو اسلامی جوش سے مغلوب ہو گئے۔ اس مجاہد ملک کی تاریخ ان کی نگاہوں کے سامنے آگئی وہ اشہب قلم کو قابو میں نہ رکھ سکے اور لکھ گئے۔

''میری جان کی قسم، اگر ساری دنیا میں اسلام کی نبض ڈوب جائے، کہیں بھی اس میں زندگی کی رمق باقی نہ رہے پھر بھی کوہ ہمالیہ اور ہندوکش کے درمیان بسنے والوں میں اسلام زندہ رہے گا وراس کا عزم جوان رہے گا۔''

افغانستان ہندوستانی مسلمان کی نظر میں

ہندوستانی مسلمان جب سخت اور دشوار ترین مراحل سے گزرتے روشنی کی کوئی کرن نظر نہ آتی، ہر طرف یاس و ناامیدی کے بادل امنڈتے دکھائی دیتے جبکہ عام طور سے انسان اتفاقات حادثات اور خارجی امداد کا سہارا تلاش کرنے لگتا ہے تو وہ افغانستان کی طرف حسرت سے دیکھتے کہ شاید یہی ملک ان کو دشواریوں اور طوفانوں سے نجات دلائے گا۔ اکثر یہ حسن ظن اور خوش فہمی حدود سے بڑھ کر حسین خوابوں اور آرزوؤں تک پہنچ جاتی ہے اور وہ خطرناک حد تک خود اعتمادی کے فقدان کا شکار ہو جاتے۔

افسوس ہے

لیکن افسوس ہے کہ دولت مند مسلم ممالک ترقی پذیر ممالک کی امداد و تعاون سے اب تک غافل ہے۔ سویت روس اور سرخ چین صورتحال سے فائدہ اٹھانے کے لیے سامنے آگئے، افغانستان کے منصوبوں کی تکمیل اور ملک کی ترقی و خوشحالی کے لیے گراں قدر امداد کی پیشکش کی۔

لازمی بات تھی کہ فکری ثقافتی اور سیاسی تمام میدانوں میں اس امداد و تعاون کا موافق رد عمل سامنے آتا چنانچہ افغانستان زندگی کے تمام شعبوں میں انہی ممالک کے تعاون سے فائدہ اٹھانے لگا۔

علمی و ثقافتی اعتبار سے الگ تھلگ

افغانستان علمی اور ثقافتی اعتبار سے عالم اسلام سے بالکل الگ تھلگ رہا۔ معروف سیاسی اسباب کی بناء پر ہمسایہ ملک پاکستان سے اس کے تعلقات کشیدہ رہے راستہ میں پاکستان کے حائل ہونے کی وجہ سے ایک تہذیبی مرکز ہندوستان سے الگ رہا، مجبوراً اسے قدیم علمی ورثہ پر قناعت کرنا پڑا۔ جدید علمی و دینی سرگرمیوں اور پیش رفت سے اس کا مضبوط اور براہ راست تعلق قائم نہیں ہو سکا اور اگر مصر اور اس کا جامع ازہر نہ ہوتا تو (جہاں آج بھی افغانی نوجوان جاتے ہیں اور فیض حاصل کرتے ہیں اور مصر میں قیام کے دوران ادب اسلامی اور فکر اسلامی کے جدید افکار و رجحانات سے واقفیت حاصل کرتے ہیں) تو اسلامی تہذیب و ثقافت اور اسلامی تحریکوں سے افغانستان کا تعلق بالکل ہی منقطع ہو جاتا اور وہ آہنی دیوار کے پیچھے بہت ہی تنگ اور محدود دائرہ میں زندگی گزار رہا ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت جو بھی پختہ فکر و خیال کے نوجوان نظر آتے ہیں وہ ازہر ہی کے تعلیم یافتہ ہیں اور مصر میں ایک عرصہ تک قیام کر چکے ہیں۔

فرد کی تربیت

فرد کی تربیت اس لیے کی جاتی ہے، اور اس کا فرض یہ ہے کہ وہ جماعت کو صراط مستقیم پر چلائے اور رکھے نہ یہ کہ اپنی غرض اور ہوس کا آلہ کار بنائے۔

انسان کی پسند کی وجہ

انسان کی پسند کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ وہ کسی فن پارے کو اپنے خوابوں کا ترجمان اور اپنے

دل کی زبان پانے لگتا ہے۔ انسان بہت خودبین اور خود پسند واقع ہوا ہے۔ اس کی محبت اور نفرت تمناؤں اور دلچسپیوں کا مرکز ومحور بڑی حد تک اس کی ذات ہی ہوتی ہے۔ اس لیے اسے ہر وہ چیز اپیل کرتی ہے جو اس کی آرزوؤں کا ساتھ دے سکے اور اس کے احساسات سے ہم آہنگ ہو جائے۔

ہر زبان کی خاص فضا

ظاہر ہے کہ ہر زبان کی خاص فضا، نفسیات اور تعبیرات ہوتی ہیں۔ جن کی جڑیں اس کی معاشرت اور تاریخ میں دیکھی جا سکتی ہیں لفظی ترجمہ اگر ان باتوں سے خالی ہو گا تو اپنا جمال اور اپنی معنویت کھو دے گا۔

یہ وضاحت بھی ضروری ہے

یہاں وضاحت بھی ضروری ہے کہ میں (علامہ ندوی) اقبال کو کوئی معصوم و مقدس ہستی اور کوئی دینی پیشوا اور امام مجتہد انہیں سمجھتا اور نہ میں ان کے کلام سے استناد اور مدح سرائی میں حد افراط کو پہنچا ہوا ہوں جیسا کہ ان کے غالی معتقدین کا شیوہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ حکیم سنائی عطار اور عارف رومی آداب شریعت کے پاس اور لحاظ اور ظاہر و باطن کی یک رنگی اور دعوت و عمل کی ہم آہنگی میں ان سے بہت آگے ہیں۔ اقبال کے یہاں اسلامی عقیدہ و فلسفہ کی ایسی تعبیریں بھی ملتی ہیں جن سے اتفاق کرنا مشکل ہے بعض پرجوش نوجوانوں کی طرح اس کا بھی قائل نہیں کہ اسلام کو ان سے بہتر کسی نے سمجھا ہی نہیں اور اس کے علوم و حقائق تک ان کے سوا کوئی پہنچا ہی نہیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ میں اپنی زندگی کے ہر دور میں اس کا قائل رہا کہ وہ اسلامیات کے ایک مخلص طالب علم رہے اور اپنے مقتدر معاصرین سے برابر استفادہ ہی کرتے رہے۔

ان کی نادر شخصیت میں بعض ایسے کمزور پہلو بھی ہیں جو ان کے علم و فن اور پیغام کی عظمت سے میل نہیں کھاتے اور جنہیں دور کرنے کا موقع انہیں نہیں ملا۔

اصل قدر و قیمت

آخر میں پھر کہتا ہوں کہ انہیں میں نے اولوالعزمی محبت اور ایمان کا نوا خواں شاعر پایا اور اپنے بارے میں میری (علامہ ندوی) گواہی یہ ہے کہ جب جب بھی ان کا کلام پڑھا تو دل جوش سے امنڈنے لگا اور لطیف جذبات نے انگڑائیاں لینا شروع کر دیں۔ احساسات و کیفیات کی لہریں بیدار ہونے لگیں اور رگوں میں شجاعت اسلامی کی رَو دوڑنے لگی، میری نظر میں یہی ان کے شعر کی اصل قدر و قیمت ہے۔

عبقریت کا حقیقی منبع محبت و یقین ہے

اگر آپ تاریخ کا مطالعہ کریں گے تو یہ حقیقت عیاں ہو جائے گی کہ دراصل رقت انگیز شعر عمیق فکر، روشن حکمت، بلند معنویت، نمایاں شجاعت، نادر شخصیت اور عبقریت کا حقیقی منبع و سر چشمہ محبت و یقین ہی ہے۔ اور تاریخ عالم میں جو کچھ بھی انسانی کمالات یا دائمی آثار و نشانات نظر آتے ہیں وہ سب کے سب اسی محبت و یقین کے مرہون منت ہے۔ اگر کوئی شخصیت یقین و محبت کے جذبہ سے خالی ہو تو پھر وہ صرف گوشت و پوست کی صورت ہے اور اگر پوری امت اس سے خالی ہے تو پھر اس کی وقعت بکریوں اور بھیڑوں کے گلے سے زیادہ نہیں۔ اور اسی طرح اگر کسی کلام میں یقین و محبت کی روح کارفرما نہیں ہے تو پھر وہ ایک مقفّٰی اور موزوں کلام تو ہو سکتا ہے لیکن ایک زندہ جاوید کلام نہیں بن سکتا اور جب کوئی کتاب اس روح سے خالی ہو تو اس کتاب کی حیثیت مجموعہ اوراق سے زیادہ نہیں ہوگی اور اسی طرح اگر کسی عبادت میں محبت و یقین کا جذبہ شامل نہیں ہے تو پھر وہ ایک بے روح ڈھانچہ ہے۔ غرضیکہ پوری زندگی اگر محبت و یقین کے جذبہ سے خالی ہو تو پھر وہ زندگی، زندگی نہیں بلکہ موت ہے اور پھر ایسی زندگی کیا جس میں طبیعتیں مردہ و افسردہ ہوں، نظم و نثر کے سرچشمے خشک ہوں اور زندگی کے شعلے بجھ چکے ہوں ایسی حالت میں یقین کامل اور حب صادق ہی حیات انسانی میں جلا پیدا کرتی ہے اور انسانی زندگی نو رنگ سے

معمور ہوجاتی ہے۔ پھر شستہ پرسوز و پر درد روح نواز اور جاں بخش کلام سننے میں آتے ہیں خارق عادت و شجاعت و قوت دیکھنے میں آتی ہے اور علم و ادب کے نقوش بھی زندہ و جاوید بن جاتے ہیں یہاں تک کہ یہی محبت اگر پانی مٹی اور اینٹ پتھر میں داخل ہوجائے تو اس کو بھی زندہ جاوید بنا دیتی ہے۔

بڑی غلط فہمی ہے

بڑی غلط فہمی میں وہ لوگ مبتلا ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ اہل علم حضرات اپنی قوت علم، کثرت معلومات اور ذکاوت و ذہانت کی وجہ سے ایک دوسرے پر فضیلت رکھتے ہیں، اور اسی طرح شعراء کو ان کی فطری قوت شاعری لفظوں کا حسن انتخاب، معانی کی مخالفت انہیں ایک دوسرے سے ممتاز کرتی ہے اور مصلحین وقت اور قائدین ملت کی بلندی پستی موقوف ہے ان کی ذہانت کی تیزی خطابت کی بلندی، سیاسی سوجھ بوجھ اور حکمت عملی پر! حالانکہ ایسا نہیں ہے، حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک کی فضیلت و بلندی کا دارومدار محبت و اخلاص پر ہے ان کی سچی محبت اور مقصد سے اخلاص کامل ہی ان کی عظمت و بزرگی کا سبب ہے۔ اس لیے کہ اس کا مقصد و موضوع اور غرض و غایت اس کی روح میں سرایت کر جاتی ہے۔ قلب میں جاگزیں ہوجاتی ہے اور فکر و عمل پر چھا جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی ذاتی خواہش مغلوب اور شخصیت تحلیل ہوجاتی ہے۔ اب وہ جب کوئی بات کرتا ہے تو مقصد کی زبان سے بات کرتا ہے۔ جب کچھ لکھتا ہے تو مقصد کی قلم سے لکھتا ہے غرضیکہ اس کے فکر و خیال، دل و دماغ اور اس کی پوری زندگی پر اس کا مقصد چھا جاتا ہے۔

بیسویں صدی کے اوائل میں

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں مسلم نوجوانوں میں مغربی تعلیم اور تربیت کا شوق ہوا۔ جس کے نتیجے میں وہ یونیورسٹیوں کا رخ کرنے لگے اس سے اتنا فائدہ ہوا

کہ فاتح قوم کا خوف اور دہشت ان کے دل سے نکل گئی۔ علمی روابط بڑھے، ثقافتی تعلقات پیدا ہوئے اور مغربی تعلیم گاہوں میں مقیم رہ کر اونچی سے اونچی تعلیم حاصل کی جانے لگی اور اس طرح مغربی ماہرین کی نگرانی میں انہوں نے مغرب کو بہت قریب سے دیکھا اور پرکھا اور مغربی زندگی کی ہر قدر پہچاننے کی کوشش کی۔

یہ بحرِ ظلمات چشمۂ حیواں نہیں رکھتا

یورپ میں علم وہنر کی روشنی تو بہت ہے لیکن سچ یہ ہے کہ یہ بحر ظلمات چشمۂ حیواں نہیں رکھتا۔ اس کی مادہ پرستی کا یہ حال ہے کہ رعنائی تعمیر رونق اور حسن میں گرجوں کی عمارت سے بینکوں کی تعمیرات بڑھی ہوئی ہیں۔ اس کی تجارت میں ایک کا نفع اور لاکھوں کی موت پوشیدہ ہے اور یہ علم وحکمت یہ سیاست وحکومت جس پر یورپ کو ناز ہے خالی خولی مظاہر ہیں جن کے پیچھے کوئی حقیقت نہیں۔ مغربی قائدین بنی آدم کا خون پیتے ہیں اور اسٹیج پر آکر انسانی مساوات اور عدالت اجتماعی کی تعلیم دیتے ہیں۔ بے کاری عریانی مے نوشی اور افلاس ہی فرنگی مدنیت کی سرفہرست فتوحات اور کارنامے ہیں۔ جو قوم فیضان سماوی سے محروم ہوتی ہے اس کے کمالات کی حد اور اس کا مبلغ علم برق وبخارات سے آگے نہیں ہوتا جس تہذیب میں مشینوں کی حکومت ہو صنعت وحرفت ہی کی بادشاہی ہو اور انہی کا سکہ چلتا ہو اس میں دلوں کی موت احساس مروت اور انسانی شرف وعزت کی ہلاکت یقینی ہے۔

مغربی معاشرے کی تصویر

اقبال مغربی معاشرے کی تصویر کشی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس میں حرکت اور ترقی بغیر طبقاتی کشمکش اور وحشیانہ مقابلے کے ممکن نہیں، دینی اور سیاسی قدروں کی تفریق اور دین ودنیا کی علیحدگی کے تصور نے اس کی وحدت ختم کر دی ہے، ہر صاحب نظر کی طرح سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں کو مادیت ہی کی دو شکلیں سمجھتے ہیں۔ جس میں ایک مشرقی اور دوسرے مغربی

ہوتے ہوئے بھی مادیت اور محدود انسانیت کے نقطے پر مل جاتی ہے۔ وہ جاوید نامہ میں سید جمال الدین افغانی کی زبان سے کہتے ہیں کہ مغربی روحانی قدروں اور غیبی حقائق کو کھوکر روح کو معدے میں تلاش کررہا ہے۔ حالانکہ روح کی قوت وحیات کا جسم سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن اشتراکیت کی نظر بطن و معدہ سے آگے جاتی ہی نہیں اور وہ حد سے حد مساوات شکم ہی تک سوچتی ہے اخوت انسانی کی تعمیر مادی و معاشی مساوات پر ممکن نہیں بلکہ اس کے لیے قلبی محبت انسانی اقدار اور معنوی و روحانی بنیادوں کی بھی ضرورت ہے۔

(اساتذہ)

مسلمانوں کی موجودہ حالت وکیفیت اقبال کی نگاہ میں

اقبال کی نگاہوں کے سامنے مسلمانوں کی موجودہ حالت و کیفیت عیاں ہے اور وہ اس حالت زار پر بے چین و پریشان اور شکوہ سنج بھی ہے۔ لیکن چونکہ اقبال یاس وقنوط کا شاعر نہیں بلکہ امید اور آس یقین وایمان کا ''پیغامبر'' ہے اس لیے وہ کمیاب بلکہ نایاب ہیں۔

در عجم گردیدم وہم در عرب
مصطفی نایاب و ارزاں ابولہب

اپنی شخصیت اور حیثیت

جو اپنی شخصیت اور حیثیت پر ظلم کرتا ہے، اور اعتماد نفس کھودیتا ہے۔ وہ عالم وجود ہی سے مٹ جاتا ہے۔ اور جو اپنی چھاؤنی سے نکل کر دشمن کی پناہ ڈھونڈتا ہے وہ ذلت وبدبختی اور محرومی و ناکامی کا منہ دیکھتا ہے۔

امت محمدیہ کے افراد

اس امت کے افراد محبت و انسانیت کے نمائندے اور امام اور ایمان و اخوت کے سچے نمونے اور مثال ہیں۔ مؤمن کی زبان ابر گوہر بار اور اس کے سیف و سنان جوہر دار ہیں۔ وہ دل کا غنی اور تلوار کا دھنی ہے۔ وہ میدان جنگ اور تلواروں کی چھاؤں میں بھی توحید و رسالت اور ایمان و توکل کا پیامبر اور خدا طلبی کی راہ میں گرم سفر رہتا ہے۔ حق و باطل کے معرکے میں قوت ایمانی اس کا اوزار اور خدا پر اعتماد اس کا ہتھیار ہوتا ہے۔

طلوع آفتاب کا منظر

طلوع آفتاب کا منظر اور صبح کا سہانا سماں ہمیشہ سے شعراء کے لیے ذوق پرور اور نشاط و انبساط کا باعث رہا ہے۔ جس سے وہ قلب و نظر کی زندگی اور فکر و خیال کی تروتازگی کا سامان پاتے رہے ہیں۔

غلامی آنکھوں پر

غلامی آنکھوں پر پٹی باندھ دیتی ہے اور کور ذوق بنا دیتی ہے۔ دنیا میں مردانِ احرار و غیور ہی کی رائے ان کے خیالات و افکار پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ فراست و بصیرت انہی کا حصہ ہوتی ہے اور صاحب زمان اور ابوالوقت وہی ہوتا ہے جو مستقبل کی جھلک اور گوہر فردا کی چمک پہلے ہی دیکھ لیتا ہے۔

کتاب و سنت

کتاب و سنت ہی اعتبار ملت اور قوت کا ذخیرہ ہیں۔ قرآن جہان ذوق و شوق کی برکات اور سنت ”عالم تحت و فوق“ کی فتوحات کی ضامن ہے۔ قرآن اگر مؤمن کا جمال ہے تو سنت اس کا

جلال۔ قرآن ہی ثبات وحیات کی بنیاد ہے اور کچھ نہیں۔

بر خور از قرآن اگر خواہی ثبات
در ضمیرش دیدہ ام آب حیات

شاہین و شہباز پنجروں میں

دین انسان کو مادیات سے اٹھا کر اسے عرفانِ نفس سکھاتا ہے جو انسان اللہ کو پالیتا ہے وہ پوری دنیا میں بھی نہیں سماسکتا اور کائنات بھی اسے تنگ محسوس ہوتی ہے۔ گھاس پھوس مٹی سے نکلتے ہیں اور مٹی ہی میں فنا ہو جاتے ہیں۔ لیکن عظمت انسانیت کا یہ انجام نہیں آدم خاکی ہے۔ لیکن اس کی روح افلاکی ہے۔ انسان کا ظاہر زمین کی طرف مائل ہے۔ لیکن اس کا اندرون کسی اور ہی عالم کا قائل ہے۔ روح مادی پابندیوں سے گھبراتی ہے اور حدود و قیود سے ناآشنا ہی رہتی ہے۔ جب اسے وطنیت کی مٹی میں بند کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو اس کا دم گھٹنے اور اس کا سانس رکنے لگتا ہے۔ شاہین و شہباز پنجروں میں کیا آشیانوں میں بھی کبھی رہنا گوارا نہیں کرتے۔

قرآن صرف ایک کتاب ہی نہیں

قرآن صرف ایک کتاب ہی نہیں بلکہ اس کے علاوہ بہت کچھ ہے۔ وہ انسان کو بدلتا ہے، اور پھر کائنات کو بدل دیتا ہے۔ یہ وہ زندہ کتاب ہدایت وسعادت ہے۔ جو قلب کائنات کی دھڑکن اور مشرق و مغرب کا ضامن ہے۔ اس سے مشرق و مغرب دونوں ہی کی تقدیر بندھی ہوئی اور انسانیت کا مستقبل وابستہ ہے۔

ہر وہ فرد یا جماعت

ہر وہ فرد یا جماعت جو دل تو رکھتی ہے، لیکن دلبر نہیں رکھتی ہے۔ محبت رکھتی ہے، لیکن محبوب سے ناآشنا ہے وہ دلجمعی اور اطمینان سے ہمیشہ محروم رہتی ہے۔ اس کی تمام قوتیں ضائع

ہوتی ہیں اور اس کی جدوجہد کبھی ایک منزل اور ایک مرکز پر قائم نہیں رہتی۔

نئی نسل کے معمار

نئی نسل کے معمار...اور اساتذہ بھی چونکہ نکمے ہیں، اس لیے وہ بھی انہیں خودی کی تعلیم نہ دے سکے۔ اور نہ انہیں ان کے منصب و مقام سے آگاہ کر سکے۔ آتش زنگ نے نئی نسل کو موم کی طرح پگھلا دیا اور اسے اپنے مطلب کے مطابق ڈھال لیا ہے اور اسے مسخ کر کے رکھ دیا ہے۔

فرزندِ ابراہیم

مسلمان آج موت و شہادت کی لذت سے بے خبر ہو چکا ہے۔ اور لاغالب الا اللہ کا یقین کھو چکا ہے۔ اب اسے حیات چند روزہ ہی کی فکر ہر دم لگی رہتی ہے اور ایک روٹی کے لیے سو (۱۰۰) انسانوں کی خوشامد اس کا پیشہ بن گیا ہے۔ فرزند ابراہیم آج بت شکنی کے بجائے بت تراشی کر رہا اور افرنگ سے نئے اصنام درآمد کر رہا ہے۔ یہ نسل نشاۃ ثانیہ کی محتاج ہے۔ آج سے پھر قم باذن اللہ کہنا ہوگا۔ ہمیں مغرب نے مسحور ہی نہیں کیا بلکہ بغیر لڑے اس نے ہمارا خاتمہ کر دیا۔ آپ کے اصحاب نے قیصر و کسریٰ کے تخت الٹ دیئے تھے۔ آج پھر اس مرد مؤمن کی ضرورت ہے جو ایمان و یقین سے تہذیب جدید کے سحر و اثر کا طلسم توڑ دے۔

فلسفہ انسان میں

پھر فلسفہ انسان کے اندر حقیقت کی جستجو، منتشر اکائیوں اور غیر مربوط اجزاء میں وحدت و ربط پیدا کرنے کی خواہش و صلاحیت پیدا کر دیتا ہے۔ اسباب و مقدمات سے نتائج اور جزئیات سے کلیات تک پہنچنے کی جو عادت ڈال دیتا ہے۔ اور جس طرح فلسفی کی نظر تغیرات و واقعات اور حوادث کی سطح پر نہیں ٹھہرتی بلکہ اس سے گزر کر ان کی تہہ تک پہنچتی ہے۔ اس سب کی بناء پر اور اس کی بدولت وہ تاریخ کے تھوڑے مطالعہ سے ان نتائج و حقائق تک پہنچ جاتے ہیں۔ جہاں

تاریخ کے وہ صدہا طالب علم اور عالم و مصنف نہیں پہنچتے جو فلسفیانہ عقل و نگاہ سے محروم اور تاریخ کے مکتب و مدرسہ کے روایتی طالب علم اور استاد ہیں۔

انسانی زندگی کی دو خانے

قدیم مذاہب بالخصوص یورپ کی مسیحیت نے انسانی زندگی کو دو خانوں میں ''دین'' ''دنیا'' میں تقسیم اور دنیا کو دو کیمپوں ''اہل دین'' اور ''اہل دنیا'' میں بانٹ دیا تھا۔ جو نہ صرف یہ کہ ایک دوسرے سے جدا تھے اور ان کے درمیان ایک موٹی سرحدی لکیر اور وسیع خلیج حائل تھی بلکہ یہ دونوں خانے ایک دوسرے سے متصادم اور یہ دونوں کیمپ باہم متحارب تھے۔ ان کے نزدیک دین و دنیا میں شدید رقابت تھی۔ جس کو ان میں سے کسی ایک سے رسم و راہ پیدا کرنی ہو۔ اسی کو دوسرے سے کلی طور پر قطع تعلق اور اعلان جنگ کرنا ضروری تھا کوئی انسان ایک وقت میں (ان کے بقول) دو کشتیوں پر سوار نہیں ہو سکتا تھا۔ معاشی جدوجہد، غفلت اور خدافراموشی کی حکومت و سلطنت، دینی و اخلاقی تعلیمات کو نظر انداز کیے اور خوف خدا سے بے نیاز ہوئے بغیر اور دین دار بننا، تارک الدنیا ہوئے بغیر متصور ہی نہ تھا۔

ظاہر ہے کہ انسان عام طور پر سہولت پسند واقع ہوا ہے۔ دین کا ایسا تصور جس میں دنیا کے کسی جائز تمتع، ترقی اور بلندی اور طاقت و حکومت کے حصول کی گنجائش نہ ہو۔ انسانوں کی اکثریت کے لیے قابل قبول اور قابل برداشت نہیں ہے۔ یہ اس کی فطرت کے خلاف ایک جنگ اور اس کی فطری خواہشات کو کچلنے کی سعی لاحاصل کے مرادف ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا کے متمدن ذہین صاحب صلاحیت اور عملی انسانوں کی بڑی تعداد نے اپنے لیے دین کے بجائے دنیا کا انتخاب کیا اور اس نے اس پر اپنے کو (ایک ناگزیر حقیقت اور ضرورت) مطمئن اور راضی بھی کر لیا۔ وہ ہر قسم کی دینی ترقی سے مایوس ہو کر دنیا کے حصول اور اس کی ترقی میں ہمہ تن مشغول ہو گئی۔ دین و دنیا کے اس تضاد کو ایک بدیہی اور مسلم حقیقت سمجھ کر انسانوں کے مختلف طبقوں اور انسانی

اداروں نے عام طور پر مذہب کو خیر باد کہا، سیاست و ریاست نے مذہب کے نمائندہ کلیسا کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور اپنے کو اس کی ہر پابندی سے آزاد کر لیا اس کا نتیجہ ظاہر تھا حکومتیں ''پیل بے زنجیر'' اور معاشرہ ''شتر بے مہار'' ہو کر رہ گیا۔ دین و دنیا کی اس دوئی، اہل دین اور اہل دنیا کی رقابت نہ صرف یہ کہ مذہب و اخلاق کے اثر کو محدود و کمزور اور انسانی زندگی اور انسانی معاشرہ کو اس کی آسمانی برکت و رحمت سے محروم کر دیا۔ بلکہ الحاد و لادینیت کا دروازہ چوپٹ کھول دیا۔ جس کا سب سے پہلے یورپ شکار ہوا۔ پھر دنیا کی دوسری قومیں جو یورپ کی فکری علمی، یا سیاسی اقتدار کے زیر اثر آئیں اس سے کم و بیش متاثر ہوئیں، قرون وسطی میں مسیحی رہبانیت کے پر جوش داعیوں اور غالی مبلغوں نے جن کے نزدیک انسانیت سے بڑھ کر روحانی، ترقی میں کوئی چیز سدراہ نہ تھی۔ اور جنہوں نے فطرت دشمنی، مردم بیزاری اور جسمانی تعذیب پر کمر باندر کھی تھی اس آگ پر تیل کا کام کیا اور مذہب کو ایسی مہیب اور وحشیانہ شکل میں پیش کیا جس کے تصور سے بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ مذہب و اخلاق کا زوال اور نفس پرستی (اپنے وسیع معنی میں) کا عروج اپنے آخری نقطہ پر پہنچ گیا۔ اور دنیا نہ صرف یہ کہ ان دو انتہائی سروں کے درمیان جھولا جھولنے لگی۔ بلکہ وہ مذہب کے بے وزنی اور بے اثر ہو جانے کی وجہ سے لادینیت اور اخلاقی انتشار کی عمیق خندق میں جا گری۔

خدا ناترس قوم یا فرد

جب کوئی خدا ناترس قوم یا فرد، اقتدار مطلق کے کسی مقام پر فائز ہو جاتی ہے اور اس کے ہاتھ میں ایسی طاقت آجاتی ہے جس سے وہ اپنے ہر منشاء کو پورا کر سکتی ہے تو پھر وہ اپنے زیر اثر افراد اور قوموں کے ساتھ جو اس کے رحم و کرم پر ہوتی ہے، مٹی کی بے جان مورتوں اور کاغذ کے پرزوں کا سا سلوک کرنے لگتی ہے۔ وہ اس کو ان کے توڑنے رکھنے پھیلانے کھولنے اور چٹکی سے مسلنے کا پورا اختیار سمجھتی ہے وہ ان کی موت و حیات کے بارے میں اپنی مرضی کے مطابق فیصلے

کرنے لگتی ہے۔

مشرق میں بہت سے دانشوروں کا احساس

مشرق میں بہت سے دانشوروں کا احساس ہے کہ اس بیسویں صدی عیسوی میں یورپ (اپنے دونوں مشرقی و مغربی کیمپوں کے ساتھ) اور امریکہ قوموں اور تہذیبوں کے اس قدیم مرض نشہ قوت اور حد سے بڑھے ہوئے "احساس برتری" کے بیمار ہیں، انہوں نے اپنے کو قوموں اور ملکوں اتالیق و سرپرست اور ان کی قسمت کا مالک سمجھ لیا ہے، وہ بھی ہر مسئلہ کو قوت کے ترازو پر تولتے اور سود و زیاں کے معیار سے جانچتے ہیں، وہ بھی دنیا کے کسی گوشہ میں کسی صالح قیادت کو ابھرنے اور اگر ابھر آئے تو پنپنے نہیں دیتے بلکہ اب تو مشرق کے بہت سے مبصروں کا خیال یہ ہے کہ اکثر مشرقی اور ایشیائی اور بالخصوص اسلامی ملکوں کی صورت حال کے بگڑنے اور وہاں کے ذہنی واخلاقی انتشار کی ذمہ دار مغرب کی یہی لیڈر شپ ہے۔

تاریخ کا ایک عظیم کلیہ

دنیا کے عجائبات میں سے تاریخ کا یہ کلیہ بھی ہے کہ جن لوگوں نے عظیم سلطنتوں کی بنیاد رکھی۔ اور جن کی بدولت خستہ حال اور پامال قوموں کی عروج و ترقی، عظمت و شوکت اور اقبال و کامرانی کے دن دیکھنے نصیب ہوئے، وہ ہمیشہ جفاکش، سخت کوش، سخت جان، ہر قسم کی راحت و تنعم سے بے نیاز اور نہایت سادہ پر مشقت اور خشک زندگی گزارنے کے عادی تھے۔ اور اسی مہم جوئی، بلند حوصلگی، اور سخت کوشی کی وجہ سے وہ سخت نا مساعد حالات میں ان سلطنتوں کی بنیاد رکھنے میں کامیاب ہوئے جو صدیوں تک ہلائے نہ ہل سکی۔ لیکن دولت و وسائل کی فراوانی، فاسد ماحول خود غرض مصاحبین اور خوشامدی درباریوں نے ان کے اخلاف و جانشینوں پر رفتہ رفتہ اثر ڈالا ان کے قوائے عمل مضمحل ہونے لگے، وہ عیش و عشرت کے خوگر تن آسانی راحت طلبی اور تنعم کے اس طرح شکار ہوئے کہ ان کو ہل کر پانی پینا دشوار ہو گیا۔ وہ رزم کے بجائے بزم کے

مرد میدان بن گئے۔ شراب و شاہد چنگ و رباب، اور مطرب و مغنی ان کے دمساز و ہمراز تھے، جن کے بغیر ان کو چین نہیں آتا تھا۔ سلطنت کی حفاظت و توسیع اور نئی نئی فتوحات کے بجائے ان کی ساری ذہانت لباسوں کی تراش خراش، کھانوں کی نئی نئی قسمیں ایجاد کرنے، اور عیش و عشرت میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے میں صرف ہونے لگی۔ اور اس میں وہ ان حدود اور اس انتہا تک پہنچ گئے جہاں آسانی کے ساتھ ایک متوسط آدمی کے تخیل اور قیاس کا پہنچنا بھی مشکل ہے، یہ تاریخ عالم کا ایسا کلیہ ہے جس میں مشکل سے استثناء ملے گا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک قانون قدرت ہے اور مال و دولت سلطنت و حکومت اور ہر طرح کے وسائل کی فراہمی و فراوانی کا ایک منطقی نتیجہ ہے۔ قرآن مجید نے اپنے مسلم ایجاز و اعجاز کے ساتھ اس حقیقت کو ان بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے: ﴿كَلَّا إِنَّ الْإِنسَانَ لَيَطْغَىٰ ۝٦﴾۔

مغرب کی قیادت کی حاشیہ بردار

اس وقت عالم کے کسی گوشہ سے کسی نئی قیادت کے ابھرنے اور کسی تازہ دم تہذیب کے میدان میں آنے کی کوئی امید نہیں ہے، اس لیے کہ دنیا کی ساری قیادتیں مغرب کی قیادت کی حاشیہ بردار اور دوسری تہذیبیں مغربی تہذیب کی حلقہ بگوش یا اس کے سامنے سپر انداز ہو چکی ہیں، اس لیے اب ایسا نظر آتا ہے کہ اب اس عمل جراحی کیلئے باہر سے کوئی نشتر نہیں آئے گا اور نہ اس کی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ بقول اقبال وہ اپنی خود لگائی ہوئی جراحتوں سے نیم جاں ہو رہی ہے۔

کہ افرنگ از جراحت ہائے پنہاں بسمل افتاد است

ایک تاریخی حقیقت

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ اصل مسئلہ خود شناسی کا ہے، اپنی قدر و قیمت پہچاننے کا ہے، آپ اپنی قدر و قیمت پہچان لیجیے۔

علامہ اقبال لکھتے ہیں۔

اپنے من میں ڈوب کر پاجا سراغ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

پیغام وشخصیت مشرق کے لیے ضروری

قومیں اور تہذیبیں شخصیتوں اور پیغاموں ہی سے زندہ رہتی ہیں لہٰذا مشرق کے لیے شخصیت اور پیغام تلاش کرنا ضروری ہے۔ ایسی شخصیت جس میں قوت ہو اعتماد ہو جس کے اندر ثبات واستقامت کا جوہر ہو، جس میں جدت طرازی اور ندرت آفرینی کی صلاحیت ہو جس میں خود اعتمادی و خود شناسی ہو، اسی طرح ایسا پیغام جس میں اخلاص پاکیزگی، لطف ورحمت، عدل و مساوات اور امن پسندی اور اخوت ہو آپ کو دور کی کوڑی لانے اور بال کی کھال نکالنے کی کوئی ضرورت نہیں، پیغام آپ کے سامنے ہے، وہ اسلام کا پیغام ہے جس سے اللہ نے آپ کو سرفراز فرمایا ہے اور جس کا حامل بنایا ہے ہمیں کسی نئے دین کی ضرورت نہیں بلکہ اس دین پر نئے ایمان کی ضرورت ہے ہمیں کوئی نیا پیغام درکار نہیں بلکہ اسی پیغام کیلئے جوش اور ولولہ کی ضرورت ہے۔ اسلامی تشخص کو قوت پہنچانے اور اسے مزید ترقی دینے کی ضرورت ہے، تاکہ گردش ایام پیچھے پلٹ جائے اور پرانی تاریخ پھر دہرائی جائے۔

ایران کے تاریخی مقامات

تاریخ کے ایک مسلمان طالب علم، قدیم آثار سے شغف رکھنے والے مؤرخ اور ملکوں ملکوں شہروں شہروں گھومنے اور ان کے حالات کا مطالعہ کرنے والے سیاح کے لیے ایران کے تاریخی مقامات میں تسکین کا پورا سامان موجود ہے۔

افتراق وغلو

افتراق اور غلو سے مسلمانوں کو وقتاً فوقتاً شدید نقصان پہنچا ہے ساتویں صدی ہجری میں تو اس اختلاف کی شدت نے تاریخ کے سب سے بڑے سانحہ سقوط بغداد کو جنم دیا۔ اس اختلاف اور غلو پسند نے مسلمانوں کو یورپ فتح کرنے اور اس کے آخری حدود تک جانے میں رکاوٹ ڈالی اس کے نتیجہ میں ہندوستان میں پہلے حکومت کمزور ہوئی پھر آخر میں اس کا چراغ ہی گل ہو گیا۔

یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہے

گزشتہ قوموں کی تاریخ اور تجربات نے یہ بات روز روشن کی طرح واضح کر دی ہے کہ جس جماعت اور قوم نے بھی زیارت گاہوں اور قبروں پر جشن منانا شروع کیا، وہ بالآخر حرم مقدس اور مسجدوں سے بے پرواہ، نماز با جماعت کے اہتمام سے بے تعلق، اور ہر مصیبت و آفت کے وقت خدا کے سامنے جھکنے اس کی طرف رجوع کرنے اور جذبہ عبدیت و بندگی سے خالی ہو گئی۔

اتحاد و یکجہتی مگر کیسے

اگر افراد اور جماعتوں کی محبوب و محترم شخصیتوں کا جب تک احترام نہ کیا جائے گا، اس وقت تک یکجہتی کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ دو آدمی ایک مقصد کے لیے جوش و خلوص صاف دلی اور جذبہ تعاون سے آپس میں مل بیٹھیں، لیکن ایک ساتھی دوسرے ساتھی کے مثالی محبوب و محترم، اور محبت و عقیدت کی مرکزی شخصیت کو نامناسب الفاظ میں یاد کرے، طنز و تشنیع اور بے سرو پا الزامات لگانے کو خدا کے یہاں تقرب کا ذریعہ خیال کرے۔ ہم میں سے ہر شخص کو اس کا تجربہ ہے۔ جب اساتذہ و شیوخ اور آباؤ اجداد کے بارے میں ہمارا یہ تجربہ ہے تو بھلا ان پاک نفوس کے بارے میں ہمارا کیا حال ہو گا۔ جن کو انسان اپنے آباؤ اجداد، اور اساتذہ و شیوخ سے کہیں زیادہ افضل اور برتر سمجھتا ہے، اور ان پر اپنی جان نثار

کرنے کے لیے تیار رہتا ہے، اور ان کو دین کا سچا خادم اور آنحضرت ﷺ کا جاں نثار فدائی خیال کرتا ہے، اور یہ سمجھتا ہے کہ صحابہ کرام نے خدا کی راہ میں جہاد کیا ہے، اور دینی دعوت کے میدان میں بیش بہا خدمات انجام دی ہیں اور دنیا کی زندگی میں زہد و تقشف اور ایثار و قربانی کے لازوال نقوش چھوڑے ہیں۔

بیروت کا نقشہ

مشہور لبنانی ادیب امین الریحانی نے اپنے ایک مضمون میں بیروت کا بہترین نقشہ کھینچا ہے وہ لکھتے ہیں

''بیروت تمدن کی ایک نعمت بھی ہے۔ اور تمدن کی ایک لعنت بھی۔ بیروت ایک مشرقی ہوتی ہے، جو تانبے کے مغربی طشت میں لکھا ہوا ہے۔ صبح کے وقت ملکہ مشرق کے پاؤں کا پازیب اور غروب کے وقت ملکہ مغرب کی کلائی کا کنگن۔ بیروت کیچڑ میں پڑا ہوا ایک در نایاب ہے جس پر بجلی کی کرنیں شرماتی ہوئی پڑتی ہیں۔ بیروت ایک مرجان ہے جو ایک ایسے ساحل پر ہے جس کا سونا ریت میں اور جس کی چاندی کیچڑ میں مل گئی ہے۔

بیروت پیرس کی ایک کنیز ہے، بیروت ایک ماہتاب ہے جس پر مغرب کی روشنی منعکس ہوتی ہے تو مشرق کو منور کرتا ہے اور مغرب کی تاریکی بھی منعکس ہوتی ہے جو مشرق کی تاریکی میں اضافہ کرتی ہے۔ بیروت علوم کا سرچشمہ اور خرافات کا گڑھ ہے۔

علماء نبض امت

اس میں کوئی شک نہیں کہ قوم کی اصلاح اور درستگی کا دارومدار علماء کی اصلاح و درستگی پر ہے۔ علماء اگر صحیح راستہ پر ہوں گے تو قوم بھی صحیح راستہ پر ہوگی۔ اور اگر علماء میں انحراف ہوگا، بے یقینی اور کمزوری ہوگی، اگر ان کے اندر مادّی خواہشات کے مقابلہ میں سپر اندازی اور حالات کے سامنے جھکنے کا رجحان ہوگا ان کا معیار زندگی بلند ہوگا ان کے اندر سادگی اور قناعت کا فقدان ہوگا

وہ تنعم پسندی اور راحت طلبی کے عادی ہوں گے تو اس کا اثر لازمی طور پر مسلم عوام پر بھی پڑے گا۔

قدرِ نعمت بعد از زوال

انسان کی فطرت ہے کہ وہ ہر ایسی چیز پر فریفتہ ہوتا ہے جو اس کے پاس موجود نہیں ہوتی۔ پہلے اسلامی معاشرہ علماء کا ادب کرتا تھا اور ان کو بڑے احترام اور عظمت کی نگاہ سے دیکھتا تھا، جب وہ زہد وقناعت، بے نیازی وبلند نفسی اور کسی قدر تقشف وسادگی سے مالامال تھے، یہاں تک کہ سلاطین و امراء ان سے ڈرتے تھے، ان کا احترام کرتے تھے، اور ان کو اپنے سے بلند سمجھتے تھے۔

لیکن آج علماء کا یہ حال ہے کہ وہ بھی راحت طلبی کی دوڑ میں سب کے ساتھ مصروف ہیں۔ اور اب ان کے درمیان اور ان کے ہم وطن وہم نسل افراد کے درمیان کوئی امتیاز باقی نہیں رہا۔ اس لیے معاشرہ بھی انہیں اسی نگاہ سے دیکھنے لگا جس نگاہ سے وہ عوام کو دیکھتا ہے اور اب لوگوں کے دلوں میں علماء کی کسی نصیحت یا تنقید کی وقعت نہیں پیدا ہوتی۔

مغربی تہذیب زود اثر وطاقتور

حضرات! میں نے مختلف تہذیبوں، ثقافتوں اور انسانی معاشروں کا جو محدود مطالعہ کیا ہے۔ اس کی روشنی میں میں (علامہ ندوی) کہہ سکتا ہوں کہ زمان ومکان اور ماحول ومتعلقات سے قطع نظر، اسلامی تہذیب کو اگر مستثنیٰ کر دیا جائے تو مغربی تہذیب سے زیادہ طاقتور زود اثر اور اس سے زیادہ نفوذ ورسوخ رکھنے والی کوئی تہذیب آج تک نہیں پائی گئی۔ مغربی تہذیب انسانی معاشرے کے ہر گوشہ میں داخل ہوگئی۔ خیالات وجذبات پر غالب آگئی، زندگی کی قدروں کو بدل ڈالا۔ سوچنے اور سمجھنے کے انداز پر اثر انداز ہوئی۔ غرض انسانی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں رہا جس پر اس کا تسلط وتصرف نہ ہو۔ وہ غریبوں کے خس خانوں میں بھی موجود ہے اور امیروں کے

نگارخانوں میں بھی۔

زندہ ضمیر کا بحران

آج علم وعقل کا بحران نہیں ہے۔ مال و مادہ کا بحران نہیں، تہذیب و تمدن کا بحران نہیں ہے، بحران اس زندہ ضمیر کا ہے جو خریدا نہ جاسکے جو کہیں کھو نہ جائے۔ جو کسی سودے بازی کو قبول نہ کرے۔ اس دل کا بحران ہے جو زندگی اور ایمان ویقین کی دولت سے مالامال ہو۔

بغداد پر ایک نظر

اسلام کی سیاسی، ثقافتی اور تہذیبی تاریخ کا جتنا بڑا حصہ بغداد سے متعلق ہے اتنا کسی دوسرے اسلامی شہر یا دارالسلطنت سے نہیں ہے۔ جتنے واقعات اور افسانے بغداد سے وابستہ ہیں اتنے کسی دوسرے شہر سے وابستہ نہیں ہیں۔ بغداد اسلامی دور میں چمکا، پوری پانچ صدیوں تک عباسی حکومت کا دارالسلطنت رہا۔ زمانہ قدیم میں متمدن دنیا کے بیشتر حصہ پر حکمرانی کی۔ ہر علم وفن کے امام پیدا کئے، دنیا کے گوشہ گوشہ سے مختلف علوم وفنون کے ماہرین نے اس کا رخ کیا۔ اور وہیں بودوباش اختیار کرلی۔ یہی وجہ ہے کہ ماہرین فن اور عظیم دانشوروں کی اتنی بڑی تعداد کا اجتماع کسی بھی دوسرے اسلامی شہر میں نہیں ہوا۔

بغداد ہی وہ مقام ہے

یہی مقام تھا جہاں امام اہل سنت احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا ابتلاء پیش آیا تھا۔ جس میں آپ نے غیر معمولی صبرو استقلال کا مظاہرہ کیا تھا۔ یہیں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے وہ حلقہائے درس قائم ہوتے تھے جن پر خلفاء کی مجلسیں بھی رشک کرتی تھیں۔ یہیں علامہ ابن الجوزی کی وعظ ونصیحت کی مجلسیں گرم ہوتی تھیں جن میں اللہ کے نیک اور صالح بندے کثرت سے شریک ہوتے تھے۔ یہیں شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا وہ مدرسہ تھا جو تعلیم و تزکیہ دونوں کا جامع تھا۔ یہیں زہد و

تقویٰ اور عفت و پاکبازی کی وہ زندگی گزری تھی جس کی تصویر ہمیں ابو نعیم اصفہانی کی کتاب ''حلیۃ الاولیاء'' اور ابن الجوزی کی ''صفوۃ الصفوۃ'' میں نظر آتی ہے اور یہیں لہو ولعب اور رقص و سرود کی وہ آزاد اور رنگین زندگی بھی بسر ہوئی ہے جس کے نمونے ابوالفرج اصفہانی کی ''کتاب الاغانی'' اور گمنام مؤلفین کی مشہور کتب ''الف لیلۃ ولیلۃ'' میں ملتے ہیں۔ بغداد ان دونوں طرز کی زندگیوں اور دونوں قسم کے رجحانات میں قیادت و سربراہی کا مقام رکھتا تھا۔ مذکورہ کتابوں میں سے ہر کتاب بغداد کی اس متضاد زندگی کے ایک نمونہ کی نمائندگی اور تصویرکشی کرتی ہے۔ بغداد جہاں دولت دجلہ و فرات کی طرح بہتی تھی، جہاں خیر و شر دونوں کے محرکات موجود تھے جہاں ''اصلاح'' اور ''افساد'' دونوں کی دعوتوں اور تحریکوں کے علمبردار موجود تھے۔ ہر بڑے شہر اور دارالسلطنت پر جس کی چھاپ تھی۔

فطرتِ بشری

انسان کی فطرت ہے کہ وہ نفع و نقصان، سود و زیاں اور کامیابی و ناکامی کے درمیان موازنہ کرتا ہے۔

دل و ضمیر کا معرکہ

دوستو! اولین معرکہ میدان جنگ سے پہلے انسان کے دل و ضمیر میں برپا ہوتا ہے۔ اور جب انسان دل و ضمیر کے داخلی معرکہ میں فتح یاب ہو جاتا ہے تو خارجی معرکوں میں اس کی کامیابی اور فتح یقینی اور لازمی شے بن جاتی ہے۔ ضمیر کا معرکہ جنگی معرکوں سے پیشتر اور پیشتر دوسرے لفظوں میں مقدم اور زیادہ اہم ہوتا ہے۔

آج کا انسان اور مسلمان

ہم ضمیر کے معرکہ میں شکست کھا چکے ہیں۔ ہمارے دل و ضمیر بکاؤ مال سامان خرید و

فروخت بن چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دشمن کے ناپاک اور توسیع پسندانہ عزائم کی راہ میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہی۔ اور ہر اجنبی کے لیے راہ ہموار ہوگئی۔ جب دشمن کا تسلط ان ملکوں پر ہو جاتا ہے تو جس طرح چاہتا ہے خرد برد کرتا ہے۔ اپنے تمام عزائم اور منصوبوں کی تکمیل کا جامہ پہنانے کی کوشش کرتا ہے اور ملک اس کے سامنے بے بس اور مجبور ہوتا ہے۔ وہ تڑپتا ہے مگر دشمن کا ہاتھ پکڑ نہیں سکتا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ قوم کے ساتھ بے وفائی اور وطن کے ساتھ غداری سے روکنے والی چیزیں دو ہی ہو سکتی ہیں، پہلی چیز طاقتور عقیدہ ہے، اور یقیناً عقیدہ ہی سب سے قابل اعتماد اور مضبوط ترین شے ہے۔ دوسری چیز سچی حب الوطنی ہے جس نے مغربی اور بعض مشرقی قوموں کے لیڈروں کو اس شرمناک جرم کے ارتکاب سے محفوظ رکھا۔ لیکن ہمارے سربراہوں اور لیڈروں کے لیے کون سا جذبہ مانع ہو سکتا ہے جن کے پاس نہ وہ عقیدہ ہے اور نہ سچی حب الوطنی۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر ہم سنتے ہیں کہ فلاں رہنما اور پارٹی لیڈر نے عرب اسلامی وطن کے بعض اہم اور جنگی علاقے دشمن کو فروخت کر دیئے یا فلاں لیڈر دشمن کا آلۂ کار اور ایجنٹ ہے۔ اور بسا اوقات ایسا نظر آتا ہے کہ اس کو خود دشمن سے زیادہ اس کے مفادات سے دلچسپی ہے گویا مدعی سست گواہ چست کا معاملہ ہے۔

اسلامی ملکوں کے حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد

اسلامی ملکوں کے حالات کا مطالعہ کرنے اور ان کی اخلاقی انارکی اور روحانی دیوالیہ پن کو دیکھنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس صورتحال کا ذمہ دار بڑی حد تک امریکہ ہے۔ امریکہ چاہتا ہے کہ یہ ممالک فکری اور اخلاقی انحراف کا شکار ہو کر اس کی پناہ لینے، اور اس کی زالہ ربائی کرنے پر مجبور ہوں، اور اپنے طاقتور حریف اسرائیل کے مقابلہ میں نہایت کمزور اور اندرونی طور سے بالکل کھوکھلے ہو جائیں ان حالات کے باقی رہنے اور بد سے بدتر ہونے میں امریکہ کے ساتھ ساتھ وٹیکان (VATICAN) کے مفادات بھی پوشیدہ ہیں۔

مغرب کے بڑھتے ہوئے سیاسی اقتدار

انیسویں صدی عیسوی کی ابتداء سے مغرب کے بڑھتے ہوئے سیاسی اقتداء اس کے نمایاں مادی تفوق؛ اور سائنس و تجربی علوم کے میدان میں اس کی پے در پے فتوحات کے اثر سے عالم اسلام میں (جو کچھ عرصہ سے فکری اضمحلال اور سیاسی ضعف انتشار کا شکار تھا) ایک ایسی ذہنی کشمکش برپا ہوئی کہ ''عصر حاضر میں اسلام کی تفہیم وتشریح'' کا کام اگر پہلے مستحب کا درجہ رکھتا تھا تو اب کم از کم فرض کفایہ بن گیا، تعلیم یافتہ نوجوانوں میں بالخصوص جنھوں نے اس صدی کے آخر یا بیسویں صدی کے اوائل میں یورپ کا سفر کیا یا ان کو انگریز حکام یا مغربی دانشوروں سے واسطہ پڑا، کچھ لوگ اسلامی عقائد کے بارے میں متزلزل میں پڑ گئے بلکہ ان سے برگشتہ اور بیزار ہو گئے، اور بڑی تعداد ذہنی وتہذیبی ارتداد کا شکار ہوئی۔

بدگمانی و اعتراض آسان

لوگوں کے لیے کسی کام کو اچھے محمل پر محمول کرنا، ناقد یا مصنف کے لیے صالح محرکات و موجبات تلاش کرنا مشکل ہوتا ہے اور شک وشبہ اور اعتراض آسان۔

احقاقِ حق اور ابطالِ باطل

لوگوں نے بہت کم دیکھا ہے کہ اشخاص اور جماعتوں کی حمایت وعصبیت سے بالاتر ہو کر اور دین اور حق کو معیار سمجھتے ہوئے (جو رد و قبول اور ترجیح و انتخاب کی اصل بنیاد و اساس ہے) احقاق حق اور ابطال باطل کا بے لاگ کام کیا گیا ہو، اور دین کو اشخاص و تحریکات، عظیم حکومتوں کے مؤسسین اور دنیا و ملت کے قائدین و محسنین پر مقدم رکھا گیا ہو جیسا کہ محدثین اور ائمہ فن جرح و تعدیل کا اپنے عہد کے صلحائے کبار زھاد و متقین، خلفائے و حکام، اور کشور کشاؤں اور فاتحین کے بارے میں شیوہ رہا ہے۔

مخلصین دین

جولوگ دین کی سنجیدہ اور مخلصانہ خدمت کرنا چاہتے ہیں، اور صرف اسلام اور خدا کے نام کی سربلندی چاہتے ہیں، نیز ان میں طلب حق کی جستجو اپنے دینی فہم کی تصحیح اور اس کی ترقی و تکمیل کا جذبہ پایا جاتا ہے، اور ان کے نزدیک معیار حق ہوتا ہے نہ کہ کوئی جماعت اور شخص (خواہ وہ کتنا بڑا ہو) انہوں نے ہمیشہ صحت مند اور تعمیری تنقید، مختلف نقطہائے نظر کے اظہار اور مخلصانہ مشورہ کی قدر کی ہے۔ یہ امت اپنی طویل تاریخ افکار اجتہادات اور تجربات کے درمیان طویل سفر میں مہلک ٹھوکروں اور اجتماعی انحراف و تحریف سے جو محفوظ رہی ہے اس کی بڑی وجہ یہی علمی احتساب اور بے غرضانہ دینی تنقید تھی۔ اس کا سلسلہ بند ہو جانا اور کسی جماعت یا مکتب خیال کا اس کی اجازت نہ دینا ایک خطرناک اقدام ہے۔ حماسہ کے عرب شاعر نے صدیوں پہلے یہ کہا تھا وہ آج بھی ایک حقیقت ہے کہ۔

وفي العتاب حياةٌ بين أقوام

قابل احترام شخصیت کی غلطی ولغزش پر سکوت کی وجہ

کسی قابل احترام شخصیت کی غلطی یا لغزش یا سہو و نسیان پر سکوت کے لیے یہ وجہ جواز نہیں ہو سکتا کہ وہ شخصیت منصب قیادت پر فائز یا ملت کے کسی اجتماعی مفاد اور خدمت میں منہمک ہے۔ اور اس سے اسلام اور مسلمانوں کو عظیم فائدہ حاصل ہو رہا ہے۔ یا حاصل ہونے کی توقع ہے۔ اس کی غلطی کی نشاندہی کرنے یا اس کو صائب مشورہ دینے سے اس کی طرف سے بے اعتمادی یا جماعت میں انتشار پیدا ہوگا، نہ اس فریضہ (انتباہ و اشارہ) کی ادائیگی میں اس شخص کی دینی خدمات مجاہدانہ کارنامے اور ذاتی فضائل و کمالات کبھی حائل ہو سکتے ہیں، چنانچہ ہم صحابہ کرام کو افضل الرسل اور خیر البشر ﷺ کو سہو و نسیان کے مواقع پر ٹوکتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ ایک بار چار رکعتوں والی نماز میں رسول اللہ ﷺ نے دو رکعتیں پڑھیں تو

ذوالیدین صحابی نے آپ ﷺ سے استفسار فرمایا کہ « أقصرت الصلوة أم نسيت يا رسول الله » (یارسول اللہ کیا نماز ہی کم کر دی گئی یا آپ کو سہو ہوا؟) نہ آپ نے اس پر برا مانا اور ان کی سرزنش کی، نہ صحابہ نے ان کو نشانہ ملامت و تعریض بنایا، بلکہ آپ نے اور صحابہ کرام نے اس سے فائدہ اٹھایا اور نماز کی تکمیل کی۔

حیرت کی بات

ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ جس جماعت کی ابتداء ہی تمام اسلامی تاریخ اور اسلامی طبقات پر عمومی اور جسارت آمیز تنقید اور تمام تحریکات اور کوششوں کے آزادانہ اور بے لاگ جائزہ سے ہوتی ہے اس کے ارکان اور رفقاء میں بانی جماعت کے لیے تقدیس کی حد تک تعظیم ہو اور ان پر ہونے والی تنقیدات و اعتراضات کے خلاف بڑی ذکاوت حس پائی جاتی ہے۔

یقین و محبت

نفسیاتی پہلو سے غور کیجیے گا تو معلوم ہو گا کہ یقین اور محبت ہی وہ شہپر ہیں، جن سے جہاد و جدوجہد کا شہباز پرواز کرتا ہے۔ مرغوبات نفسانی، عادات، مالوفات، مادی مصالح و منافع، اغراض و خواہشات کی پستیوں سے وہی شخص بچ سکتا ہے، جس میں کسی حقیقت کی یقین اور کسی مقصد کے عشق نے پارہ کی ''تقدیر سیمابی'' اور بجلیوں کی بیتابی پیدا کر دی ہو۔

انسانی زندگی کا طویل ترین تجربہ ہے کہ محض معلومات و تحقیقات اور مجرد قوانین و ضوابط، اور صرف نظم و ضبط، سرفروشی و جانبازی بلکہ سہل تر ایثار و قربانی کی طاقت و آمادگی پیدا کرنے کے لیے بھی کافی نہیں ہے۔ اس لیے اس سے کہیں زیادہ گہرے اور طاقتور تعلق اور ایک ایسی روحانی لالچ اور غیر مادی فائدے کی یقین کی ضرورت ہے کہ اس کے مقابلہ میں زندگی بار دوش معلوم ہونے لگی کسی ایسے ہی موقعہ اور حال میں کہنے والے نے کہا تھا۔

جان کی قیمت دیار عشق میں ہے کوئے دوست

اس نوید جانفزا سے سرو بال دوش ہے

تاریخ کا بے لاگ فیصلہ

حقیقتاً تاریخ کا موضوع ایسا واقعاتی، حقیقت پسند اور ذکی الحس ہے کہ وہاں کوئی بات روا روی میں نہیں کہی جا سکتی، اس کے لیے تاریخی شہادتوں، حوالوں اور اعداد و شمار کی ضرورت ہوتی ہے، اور تاریخ کسی بڑے سے بڑے اہل قلم، داعی دین یا صاحب فکر کے احترام میں اپنا ناقدانہ فیصلہ صادر کرنے سے باز نہیں رہتی۔

اختلاف و تردید

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بعض اوقات اختلاف و تردید اور اس طریق کار کو سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ تحقیق و نقطۂ نظر کا اختلاف اور خالص دین اور مسلمانوں کے مفاد میں اس کا اظہار و اعلان نہ صرف یہ کہ سلف سے لے کر خلف تک کا شیوہ اور شعار رہا ہے، بلکہ دین کی جزئی (تحریف) سے اور ملت کے (کلی) انحراف سے محفوظ رہنے میں اس کا بڑا دخل ہے۔

ائمہ مجتہدین اور تنقید

ائمہ مجتہدین کا تو ذکر ہی کیا کہ ان پر تو نفسانیت، حسد اور معاصرت کے فتنہ کا شبہ بھی نہیں کیا جا سکتا، جن لوگوں کا شمار زمانہ، مرتبہ، علم اور مقبولیت میں ان کے بعد ہوتا ہے۔ انہوں نے بھی تحقیق و نقطۂ نظر کے اس اختلاف کو نہ صرف گوارہ کیا بلکہ اس کا خیر مقدم کیا اور اس کیلئے اپنے ناقدین کے ممنون و شکر گزار ہوئے۔ ان کے متبعین و معتقدین نے بھی ان کے معاصرین و ہم طبقہ لوگوں کی تنقید و تحقیق کو بھی در خور اعتناء و لائق توجہ سمجھا اور ان پر کسی ذاتی غرض یا اسلامی مفاد کو نقصان پہنچانے کا الزام نہیں لگایا۔ حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ پر ابن جوزی اور امام ابن

تیمیہ کی تنقیدیں، اور خود شیخ الاسلام ابن تیمیہ پر ان کے معاصرین کی تنقیدیں جو ان کے مجیر العقول شجر نادرہ روز گار ذکاوت اور غیر مشتبہ اخلاص کے قائل تھے (مثلاً علامہ ذہبی اور ابن دقیق العید وغیرہ) اس کا نمونہ ہیں۔ اس طرح صوفیائے کرام میں پورے اشراف واحترام کے ساتھ ایک کا دوسرے سے اختلاف اور بعض اوقات کسی تحقیق یا حال کی تردید کوئی مخفی راز نہیں۔

امت کا وجود

اس امت کا وجود دنیا کے ہر گوشہ میں مادی حقیقتوں اور جسمانی لذتوں کے علاوہ ایک بالکل دوسری حقیقت کے وجود کا اعلان تھا۔ اس کا ہر فرد پیدا ہو کر اور مر کر بھی اس حقیقت کا اعلان کرتا تھا کہ دنیا کی طاقتوں سے بڑی ایک دوسری طاقت ہے اور اس زندگی سے زیادہ حقیقی دوسری زندگی ہے۔

انسان سراپا احتیاج

انسان سراپا احتیاج، مجسم صورت سوال، اور ہمہ تن کاسہ گدائی ہے۔ اس کی ضرورتیں بے پایاں اور گویا غیر محدود، اس کے جسمانی اور روحانی مطالبے اور تقاضے حد سے بڑھے ہوئے، اس کی فطرت حریص اور غیر قانع ہے۔ اس لیے وہ کسی ایسی ہستی کے سہارے نہیں جی سکتا جس کی طاقت و اختیار جس کی بخشش و رزاقی، جس کی اطلاع و واقفیت خواہ کتنی وسیع ہو لیکن محدود ہے۔

انسان شیشہ سے زیادہ نازک

انسان اپنی فطرت میں شیشہ سے زیادہ نازک اور حباب سے زیادہ کمزور ہے۔ وہ اپنے وجود و بقاء کے لیے صدہا چیزوں کا محتاج ہے اور اس عالم میں ہزاروں موجودات اس کے دشمن ہیں، اس کی حفاظت وہی کر سکتا ہے جو کائنات پر فرمانروائی کرتا ہو۔ عناصر پر جس کا قبضہ ہو، اشیاء کے خواص و اثرات اس کی مٹھی میں ہوں، وہ ان کا پیدا کرنے والا بھی ہو، ان کو نظم و ضبط میں رکھنے والا

بھی ہو، اور ان کو سلب کر لینے، تبدیل کر دینے کی قدرت بھی رکھتا ہو، اس کے دست قدرت میں کبھی رعشہ اور اس کے پایۂ حکومت میں کبھی لغزش و اضطراب نہ ہو کہ ایک خفیف ارتعاش اور ایک ادنیٰ لغزش و اضطراب آفاق و انفس کی اس کی کارگۂ شیشہ گری کو برباد اور اضداد و متناقضات کے اس کارخانہ کو ٹکرا کر درہم برہم کر سکتا ہے، اس کا علم حاضر اور محیط ہو، وہ ہمہ وقت ہوشیار و بیدار ہو، سہو و نسیان، غفلت اور نیند کا خمار بھی کبھی اس کے پاس نہ آسکے کہ مخلوقات بے شمار اور ان کی ضرورتیں بے حد و حساب اور ایسی مخفی ہے کہ ان کو خود خبر نہیں، وہ طفل شیر خوار سے زیادہ پرورش و نگرانی کا محتاج اور محبت و شفقت کا مستحق ہے۔ اس کو ایسی ہی ہستی کی ضرورت ہے، جو ماں باپ سے زیادہ شفیق ہو، لیکن اس کی شفقت میں رحمت و حکمت دونوں ہوں کہ اس کی شریعت کے لیے دونوں ناگزیر ہیں۔

دھوکہ اور غفلت

اس عالم میں موہوم نفع و ضد کا چشمہ سراب اس طرح متموج ہے کہ انسان کی نظر بار بار دھوکہ کھاتی ہے، اور اپنی جیسی صدہا مجبور و بے اختیار ہستیوں کو نافع و ضار اور قادر و مختار سمجھ کر اپنا الہ و معبود بنا لیتا ہے، اور یہ طلسم بعض اوقات زندگی بھر نہیں ٹوٹتا۔

انسان کھائے پیئے، پڑا رہے اور اس کی نسل چلتی رہے اور بعض اوقات علم میں آسمان کے تارے توڑ لائے، اور بڑے بڑے سمندر و صحرا طے کر لے لیکن اپنے پیدا کرنے والے کو نہ پہچانے۔ اس سے بڑھ کر جہالت کیا ہو سکتی ہے لیکن دنیا میں یہی ہو رہا تھا کروڑوں انسان اپنے پیدا کرنے والے کو نہیں جانتے تھے، باپ کو جانتے تھے لیکن باپ کو کس نے پیدا کیا، پھر اس کے باپ کو کس نے پیدا کیا؟ پھر اس کو اور آگے حضرت آدمؑ تک لے جایئے، یہ کوئی نسب نامہ نہیں ہے، لیکن ہم کو کس نے پیدا کیا؟ کائنات کو کس نے بنایا؟ زمین و آسمان کی کس نے خلقت کی؟ پہاڑ کس نے کھڑے کئے، یہ باغ کس نے اگائے؟ اور روزی کون دیتا ہے؟ اور اچھی بری تقدیر

کس نے بنائی؟ اور کون موت و زندگی کا مالک ہے؟ آج اگر کوئی شخص ہندی نہیں پڑھا ہے تو لوگ کہیں گے کہ 'ان پڑھ' ہے اور اگر اردو نہیں پڑھا ہے تو مسلمانوں کے حلقہ میں ناخواندہ کہیں گے اور عربی نہیں پڑھا ہے تو عرب کہیں گے امّی ہے، جاہل ہے۔ لیکن اس سے بڑھ کر کیا جہالت ہو سکتی ہے کہ اپنے پیدا کرنے والے ہی کو نہ جانے کہ وہی عبادت کا مستحق ہے۔ دنیا اس سے بالکل ناآشنا تھی، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو مبعوث فرمایا۔

نفی اثبات سے زیادہ آسان

یہ واقعہ ہے کہ جب انسان یقین و روشنی سے محروم ہو تو اس کے لیے "نفی" "اثبات" سے زیادہ آسان ہوتی ہے۔ اسی لیے فلاسفہ یونان کے الٰہیات میں نتائج بحث و تحقیق اکثر منفی ہیں، اور کوئی دین کوئی مذہب، کوئی نظام حیات بھی نفی پر قائم نہیں ہوتا۔

تصوف کا حاصل و مقصود

بالخصوص طریقت کا حاصل و مقصود، اور تصوف کا خلاصہ و مطلوب اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ سے ایسا تعلق و ارتباط پیدا ہو، جس میں کبھی کوئی فرق ہی نہ ہوا، ایسی حضوری جس میں کبھی غیبت اور ایسی یکسوئی جس میں کوئی کشمکش نہ ہو، یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک آفاق و انفس کی تمام اشیاء کے متعلق نفع و ضرر، قدرت و اختیار کا خیال زائل نہ ہو جائے، اور قلب و دماغ ان کی محبت و عظمت اور ان سے خوف و طمع رکھنے سے کامل طور پر آزادانہ ہو جائیں، اور وہ کسی معنی میں بھی مقصود و مطلوب، مرغوب و مرھوب، اور معظم و محبوب اور بالا ختصار الٰہ و معبود نہ رہیں۔ یہی مقام اخلاص ہے، جس کی طرف انبیاء علیہم السلام اور ان کے جانشین رہنمائی فرماتے ہیں۔

باطنی بیماریوں کی جڑ

باطنی بیماریوں کی جڑ، اور معنوی امراض کی اصل، قلب کی ماسوی اللہ کے ساتھ گرفتاری اور

مشغولی ہے۔ جب اس گرفتاری سے مکمل طور پر آزادی میسر نہ آئے سلامتی محال ہے کیونکہ اللہ جل سلطانہ کی بارگاہ اور حضور میں کسی کی شرکت کی کسی طرح گنجائش نہیں۔ قرآن کی آیت ہے ''خالص پرستش واطاعت اللہ ہی کا حق ہے'' چہ جائیکہ شریک کو غالب بنالیں بڑی بے حیائی ہے کہ غیر اللہ کی محبت کو اس درجہ غالب بنالیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت اس کے پہلو میں معدوم یا مغلوب ہو جائے۔

عاشق صادق

ایک عاشق صادق کو جتنی محبت ہوتی ہے، اتنی ہی غیرت ہوتی ہے، غیرت تابع ہے محبت کے، غیرت تابع ہے علم کے، غیرت تابع ہے خلوص کے۔

عقیدہ توحید مسلمانوں کا بین الاقوامی شعار

توحید مسلمانوں کی تہذیب کا بین الاقوامی شعار اور علامت ہے۔ جو عقائد سے لے کر اعمال تک اور عبادات سے لے کر تقریبات تک ہر جگہ نمایاں نظر آئے گا۔ ان کی مسجدوں کے مینارے پانچ مرتبہ اس کا اعلان کرتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت اور بندگی کا مستحق نہیں۔ ان کے مکانات اور نگار خانوں کو بھی اسلامی اصول کے مطابق بت پرستی اور شرک کے شعار سے محفوظ ہونا چاہیے۔ تصاویر اسٹیچو، مورتیاں ان کے لیے ناجائز ہیں۔ یہاں تک کہ بچوں کے کھلونوں میں بھی اس کا لحاظ ضروری ہے۔ دینی تقریبات ہوں، یا ملکی جشن مسرت، سیاسی رہنماؤں کا یوم ولادت ہو یا مذہبی پیشواؤں کا جنم دن یا پرچم کشائی کی تقریب، تصاویر اور مجسموں کے سامنے جھکنا، ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کھڑا ہونا، یا ان کو ہار پھول پہنانا، مسلمانوں کے لیے ممنوع اور اس کی موحدانہ تہذیب کے خلاف ہے، اور جہاں کہیں مسلمان اپنی اسلامی تہذیب پر قائم اور اس پر کاربند ہوں گے۔ وہ اس فعل سے محترز اور علیحدہ ہوں گے۔ ناموں میں، تقریبات میں، قسم میں، بزرگوں کی تعظیم واحترام اور اظہار نیاز مندی میں، مجازی توحید کے حدود سے تجاوز

اور کسی قوم کی تقلید، اسلام سے انحراف کے مرادف ہے۔

شرک ضعف کا سبب ہے

شرک ضعف کا سبب ہے۔ ہمیشہ رہا ہے اور ہمیشہ رہے گا ﴿سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ﴾ اللہ تعالیٰ نے اشیاء میں خاصیتیں پیدا کی ہیں، زہر میں ایک خاصیت ہے۔ تریاق میں ایک خاصیت ہے، پانی میں ایک خاصیت ہے، آگ میں ایک خاصیت ہے۔ اسی طرح شرک میں کمزوری کی خاصیت ہے، اور توحید میں طاقت اور بے خوفی اور بے رعبی کی خاصیت ہے۔ اسی لیے سب سے بڑی ضرورت اس کی ہے کہ عقائد کی تصحیح ہو خدا کے ساتھ ابراہیمی محمدی قرآنی تعلیم کے مطابق توحید کا رشتہ استوار ہو، اس رشتہ کو پھر استحکام کی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ شیطان ہمیشہ تاک میں رہتا ہے، وہ ہمیشہ چھاپا مارتا رہتا ہے، ور چور وہیں جاتا ہے جہاں دولت ہوتی ہے۔ جس کے پاس توحید کی، ایمان کی دولت ہے اس کے لیے خطرہ ہے، ان کے لیے میں یہ خطرہ نہیں بتاتا جن کے پاس سرے سے یہ نعمت نہیں۔

دنیا ایک مرتب مشین

دنیا ایک مرتب و متوازن مشین ہے، جس کا ہر پرزہ اپنی جگہ پر کار آمد ہے اور دوسرے پرزے کی امداد کر رہا ہے۔ یا ایک بڑا کارخانہ ہے جس میں صدہا مشینیں چل رہی ہے۔ ہر مشین کو دوسری مشین سے پورا تعلق ہے۔ اور یہ پوری مشین یا پورا کارخانہ ایک صاحب علم و صاحب اختیار طاقت کے ہاتھ میں ہے جو اس کو ایک قانون اور نظام کے ماتحت جو اس کا وضع کیا ہوا ہے چلا رہا ہے۔

مروجہ علوم میں دخل نہیں دیتے

انبیاء کرام ارفع و اعلیٰ صلاحیتوں، احساس کی لطافت و نزاکت اور فطری ذہانت و ذکاوت کے

مالک ہونے کے باوجود اپنے زمانے کے مروجہ اور عام علوم میں دخل نہیں دیتے۔ نہ ان علوم و فنون میں اپنے کمال یا اپنی مہارت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ بلکہ وہ تمام چیزوں سے بالکل الگ صرف اس فریضہ کی ادائیگی اور اس خدمت کے انجام دینے میں مشغول رہتے ہیں جن کے لیے وہ مبعوث کیے گئے ہیں۔ جن کے مامور بنائے گئے ہیں اور جن پر انسان کی شقاوت و سعادت کا دارومدار ہے وہ انہیں علوم کو دوسروں تک پہنچانے کی دھن میں لگے رہتے ہیں۔

تمدن کس کا نام؟

تمدن اینٹ اور چونے کا غذ اور کپڑوں کے تنوع کا نام نہیں ہے نہ حیوانی تقاضوں کو انسانی ہنرمندی سے پورا کرنے اور اس کے لیے ایک دوسرے سے تعاون کرنے کا نام ہے۔ تمدن اس اجتماعی زندگی کا نام ہے جس میں قدرت کے قائم کیے ہوئے حدود قائم ہیں، ہر فرد جماعت کو اس کا واجبی حق ملے اور عقائد و اخلاق اور قانون و حکومت کے تعاون سے ایک ایسا ماحول پیدا ہو، جس میں انسان کو فطرت کا منشاء پورا کرنے اور اپنے کمال مطلوب تک پہنچنے میں امداد ملے۔

جاہلیت کی پوری تصویر

ہمارے مؤرخوں اور سیرت نگاروں سے جاہلیت کی تصویر پورے طور پر نہ کھنچ سکی، وہ نہ صرف قابل معافی بلکہ ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں کہ ادب اور زبان کا ذخیرہ ساتھ نہیں دیتا، واقعہ اور صورتحال اتنی سنگین، اتنی نازک، اتنی مہیب اور اتنی پیچیدہ اور دقیق تھی کہ موئے قلم سے اس کی تصویر اور زبان و ادب کی بڑی سے بڑی قدرت و صلاحیت سے اس کی تعبیر ممکن نہیں کوئی مؤرخ اس کا حق کیسے ادا کر سکتا ہے۔

نئے نئے نشتر و جراح

جب تمدن اپنی حدود سے تجاوز کر جاتا ہے، جب وہ اخلاقیات کو یکسر فراموش کر دیتا ہے،

جب انسان اپنی سفلی خواہشات اور نفس کے حیوانی تقاضوں کی تکمیل کے سوا ہر مقصد اور ہر حقیقت کو فراموش کر دیتا ہے جب اس کے پہلو میں انسان کے دل کی بجائے بھیڑیئے اور چیتے کا دل پیدا ہو جاتا ہے، جب اس کے جسم میں ایک فرضی معدہ اور ایک لا محدود نفس امارہ جنم لیتا ہے، جب دنیا پر جنون کا دورہ پڑتا ہے تو قدرت خداوندی اس کو سزا دینے یا اس کے جنون کے نشہ کو اتارنے کے لیے نئے نئے نشتر اور نئے نئے جراح پیدا کرتی ہے۔

پیدا جنون اندازِ ملوکیت ہے کرتی
چنگیز یا ہو تیمور ہیں نشتر کے اللہ

گناہ ایک عارضی حالت

محمد رسول اللہ ﷺ نے گناہوں لغزشوں اور غلطیوں کو ایک عارضی حالت قرار دیا۔ جس میں انسان کبھی کبھی اپنی نادانی کو تاہ نظری اور نفس و شیطان کی ترغیب سے مبتلا ہو جاتا ہے۔ صلاحیت، خیر پسندی اور اعتراف قصور و ندامت اس کی فطرت کا اصل تقاضا اور انسانیت کا جوہر ہے۔

تاریخ گواہ ہے

تاریخ گواہ ہے کہ انسانی زندگی کی جڑیں اور اس کے جھوٹے قصر زندگی کی بنیادیں کبھی اس زور سے نہیں ہلائی گئیں جیسی اس پیغام لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے اعلان سے ہلائی گئیں، اور دنیا کے پلید ذہن پر کبھی ایسی چوٹ نہیں پڑی تھی جیسے ان لفظوں سے پڑی۔ وہ غصہ سے تلملا گیا۔ اور اس نے جھنجھلا کر کہا ﴿أَجَعَلَ الْآلِهَةَ إِلَٰهًا وَاحِدًا ۖ إِنَّ هَٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ﴾ کیا ان سب کو جن کی ہم پرستش کرتے تھے اور جن کے ہم بندے بنے ہوئے تھے اڑا کر ایک ہی معبود مقصود رکھا ہے۔ یہ تو بڑے اچنبھے کی بات ہے اس ذہن کے نمائندوں نے فیصلہ کیا کہ یہ ہمارے نظام زندگی کے خلاف ایک گہری اور منظم سازش ہے اور ہم کو اس کا مطالبہ کرنا ہے ﴿وَ

انْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا وَ اصْبِرُوْا عَلٰۤى اٰلِهَتِكُمْ ۖۚ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ یُّرَادُ﴾ یراد ان کے سردار اور ذمہ دار ایک دوسرے کے پاس گئے کہ چلو اور اپنے معبودوں پر جمے رہو یہ تو کوئی طے کی ہوئی بات معلوم ہوتی ہے یہ نعرہ زندگی اور انسانیت کے پورے تصور پر ایک کاری ضرب تھی جو ذہن کے پورے سانچے اور زندگی کے پورے ڈھانچہ کو متاثر کرتی تھی۔اس کا مطلب تھا جیسا کہ آج تک سمجھا جاتا رہا، یہ دنیا کوئی خودرو جنگل نہیں، بلکہ یہ مالی کا لگایا ہوا آراستہ باغ ہے، اور انسان اس باغ کا سب سے اعلیٰ پھول ہے یہ گل سرسبد جو ہزاروں بہاروں کا سرمایہ ہے بے مقصد نہیں کہ مل رل کر رہ جائے، انسان کے جوہر انسانیت کی اس کے اخلاق کے سوا کوئی قیمت پرداز روح اور وہ مضطرب دل ہے کہ ساری دنیا مل کر اس کی تسکین نہیں کر سکتی، اور یہ سست عناصر دنیا اس کے ساتھ نہیں چل سکتی۔اس کے لیے غیر فانی زندگی اور ایک لامحدود دنیا درکار ہے۔جس کے سامنے یہ زندگی ایک قطرہ اور یہ دنیا بازیچہ اطفال ہے۔وہاں کی راحت کے سامنے یہاں کی راحت اور وہاں کی تکلیف کے سامنے یہاں کی کوئی تکلیف حقیقت نہیں رکھتی۔ اس لیے انسانیت کا فطری تقاضہ خدائے واحد کی عبادت اس کی خودشناسی رضائے الٰہی کی طلب اور اس کی زندگی اس کے لیے جدوجہد ہے۔

زندگی کی روح نکل جائے گی

مادی زندگی کا کوئی شمہ مؤمن کے دم سے قائم نہیں، وہ اگر کسی ملک سے چلا جائے تو اس کی ظاہری زندگی میں کوئی خلل واقع نہیں ہوگا۔دنیا جس طرح کھاتی کماتی ہے، کھاتی کماتی رہے گی۔ انسان جس طرح جیتے مرتے ہیں جیتے مرتے رہیں گے، مگر یاد رہے کہ زندگی کی روح نکل جائے گی اور وہ ایک بے جان جسم ہو کر رہ جائے گی۔

دنیا کی بہت بڑی طاقت

یقین دنیا کی بہت بڑی طاقت ہے۔جب بھی کوئی مرد خدا کسی بات پر پہاڑ کی طرح جم گیا،

اور اس نے حالات کے سامنے سپر ڈالنے سے انکار کردیا اور اپنے یقین کا رشتہ مضبوط ہاتھوں سے تھام لیا تو زمانے کے بہتے ہوئے دھارے کا منہ پھر گیا، اور مبصروں کے اندازے غلط نکل گئے۔ اسلامی تاریخ میں اس طرح کی مثالیں جابجا ملتی ہیں۔

چار ضروری شرائط

اس یقین کے لیے جس کے ساتھ اللہ کی مدد ہوتی ہے ضروری ہے کہ

(۱) وہ خالص اللہ کے اعتماد پر ہو مخلوق کے کسی وعدہ یا کسی امید پر نہ ہو۔

(۲) مشورہ و تدبیر میں کوئی کمی نہ کی جائے۔ پھر بصیرت ایمانی جو کچھ فیصلہ کرے اس پر مضبوطی سے قائم ہو جایا جائے۔

(۳) صاحب یقین ایمان واخلاص کی دولت سے مالامال اور عمل صالح سے متفق ہو اور اللہ تعالیٰ سے بندگی کا خصوصی تعلق رکھتا ہو۔

(۴) اس کی بنیاد حق اور صداقت ہو، اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا مقدمہ جعلی اور کمزور نہ ہو۔

ان صفات کے بعد وہ پیش آئے گا جس کے وعدہ اس آیت میں کیا گیا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَٰئِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ ○ نَحْنُ أَوْلِيَاؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ۔

امت مسلمہ کا سدا بہار درخت

امت مسلمہ کا سدا بہار درخت ہمیشہ نئی نئی پتیاں اور ہری بھری ڈالیں پیدا کرتا رہا، اور لباس بدلتا رہا، باغ باغ کے پھول اور چمن چمن کے شگوفے اس امت کے گلدستہ میں نظر آتے ہیں، اور اپنی بہار دکھاتے ہیں۔ اس کے اندر ساری قوموں کا وزن اور تمام نسلوں کا ست ہے، وہ انسانیت کا جوہر اور انسانی طاقتوں کا سب سے بڑا خزانہ ہے۔

ایک ابدی پیغام

اسلام کا پیغام ایک ابدی پیغام ہے۔ جو کسی نسل و قوم کے ساتھ مخصوص نہیں، قومیں اور نسلیں اس کے لیے لباس کی حیثیت رکھتی ہے، جب ایک لباس بوسیدہ اور ناکارہ ہو جاتا ہے تو وہ ایک نیا ملبوس زیب بدن کر لیتا ہے۔

نئے خون نئی امنگوں کی ضرورت

اسلام کو اس وقت نئے خون نئی امنگوں نئے ولولے اور نئے جوش عمل اور جذبہ قربانی کی ضرورت ہے۔ یہ نیا خون نیا جوش اور قربانی بہت سی جگہ موجود ہے لیکن پست مقاصد اور غلط میدانوں میں صرف ہو رہا ہے جو چیز اسلام کے کام نہیں آرہی ہے وہ صرف ضائع نہیں ہو رہی ہے۔ بلکہ دنیا کی تباہی کا باعث ہو رہی ہے۔ اسلام کی دعوت ابھی ان گوشوں میں نہیں پہنچی، ہمارا فرض ہے کہ ہم اسلام کو ان قوموں اور طبقوں تک پہنچا کر اسلام کی طاقت اور ایمان کی ان کیفیات کا تماشہ دیکھیں جو ہمیں دنیا کی تاریخ میں نومسلموں کی زندگی میں وقتاً فوقتاً نظر آتی ہے۔ ہمیں ان نو مسلموں کی زندگی میں اسلام کی صداقت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت و امامت عالم پر اس درجہ کا یقین، ذات نبوی کے ساتھ وہ عشق و شیفتگی اور اسلام کی برتری کے لیے ایسی جدوجہد اور سرفروشی دیکھنے میں آئے گی جس کے سامنے ہم پشتنی مسلمانوں کو شرم آئے گی اور جس کی نظیر صدیوں سے دیکھنے میں نہیں آئی ہوگی۔

مذہب اور تہذیب

مذہب اصول دیتا ہے، تہذیب بنے بنائے سانچے، مذہب زندگی کو وسیع اور لچکدار بناتا ہے۔ تہذیب تنگ اور بے لچک بناتی ہے۔ مذہب تمام انسانوں کو ایک طرح کے اصول زندگی، ایک مقصد زندگی ایک روح زندگی اور پیغام زندگی دیتا ہے۔ اور تہذیب چھوٹے چھوٹے دائروں

میں تقسیم کر کے ایک دوسرے کے درمیان رسوم وعادات کی دیواریں کھڑی کر دیتی ہے۔

سب سے پہلے اخلاقی ضرورت

خدا کا یقین اور دوسری زندگی کا عقیدہ ہی ہے جو ملک کو اخلاقی گراوٹ۔ بے اصولیوں، نفع خوری، رشوت ستانی، اور دولت کی بڑھی ہوئی ہوس کو روک سکتا ہے۔ اور اخلاقی احساس اور پختگی پیدا کر سکتا ہے۔ اس لیے ہماری تمام علمی اور ادبی تہذیبی اور لسانی ضرورتوں پر یہ اخلاقی ضرورت مقدم ہے۔

ذمہ داری کا احساس

ملک کا سب سے بڑا مسئلہ جس پر عام سیاسی رہنماؤں اور ملک کے سچے خیر خواہوں کو پوری توجہ کرنی چاہیئے۔ وہ ہے ملک کی اخلاقی اصلاح، سماجی سدھار، اور ذمہ داری کا احساس۔ یاد رہے جب سوسائٹی اخلاقی طور پر دیوالیہ اور معنوی حیثیت سے کھوکھلی ہو جائے تو اس کو نہ حکومت بچا سکتی ہے نہ جمہوری نظام نہ ایک زبان اور ایک کلچر۔

قوموں کی زندگی کے اتار چڑھاؤ

قوموں کی زندگی کے اتار چڑھاؤ، اور دنیا کی تاریخ پر جن لوگوں کی نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ قومی اور سیاسی زندگی میں سوسائٹی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔ صحیح اخلاقی اور پختہ سیاسی سمجھ اور ایک اچھی سوسائٹی حکومت کو پیدا کرتی ہے۔ اس کی تنظیم کرتی ہے، اس کو ترقی دیتی ہے، مزاج سے اس کی حفاظت کرتی ہے، جب اس کی رگیں خشک ہونے لگتی ہیں تو اس کی رگوں میں تازہ اور گرم خون پہنچاتی ہے، اس کو وقت پر ذمہ دار پر جوش اور کام کے آدمی دیتی ہے۔ حقیقت میں مہذب و منظم سوسائٹی جو یقین کی دولت، اصول و اخلاق کا سرمایہ، فرض کا احساس اور ایثار و قربانی کا جذبہ رکھتی ہے وہ سرجیون ہے، جس سے خوشحالی آزادی اور ترقی کی نہریں نکلتی ہیں، اور

پورے ملک کو ہرا بھرا رکھتی ہیں۔ اگر سوسائٹی میں اخلاق کی گراوٹ و بے اصولی اور خود غرضی خوشامد، طاقت و دولت سے مرعوبیت بزدلی اور ظلم کا چلن عام ہو جائے تو یوں سمجھئے کہ زندگی کا سوتا خشک ہو گیا، اور قومی زندگی کے درخت کو گھن لگ گیا ہے، حکومتوں کا الٹ پھیر، طاقت کی بہتات، ملک کی پیداوار تعلیم کی ترقی اور ظاہری دھوم دھام کوئی چیز اس قوم کو تباہی سے نہیں بچا سکتی۔ جب کسی درخت کی رگیں اور جڑیں سوکھ جائیں اور وہ اندر سے کھوکھلا ہو جائے تو اوپر سے پانی ڈالنے سے کام نہیں چلتا۔

ہندوستانی سوسائٹی

ہماری ہندوستانی سوسائٹی پرانے زمانہ میں اپنے فلسفہ و حکمت اور ادب و شاعری میں نیز اخلاقی جرأت، سچائی، ایمانداری اور بے لاگ پن میں کہاوت کی طرح مشہور تھی۔ یہاں کی اخلاقی کہانیاں، اور اخلاق کے اعلیٰ اصول سوغات کی طرح دیس دیس جاتے تھے۔ پانچویں صدی میں ایران نے جو علم و تہذیب کا مرکز تھا۔ ایک بہت بڑا عالم بھیجا تھا کہ وہ یہاں کی اخلاقی تعلیم اور اخلاقی کہانیوں کا پہلوی زبان میں ترجمہ کرے۔ عربوں نے بھی اپنے دور میں ان کہانیوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا، آج بھی اس کا ترجمہ "كليلة و دمنة" ایک سدا بہار کتاب ہے۔

سچی بات

سچی بات تو یہ ہے کہ سوسائٹی کی تعمیر تو پیغمبروں ہی کے اصولوں پر ہوتی ہے۔ وہ اپنی ساری توجہ اور خدا کی دی ہوئی طاقتیں اسی کام پر لگا دیتے ہیں۔ اور ان کی نظر کبھی اس مقصد سے نہیں چوکتی وہ مسائل کو گڈمڈ نہیں کرتے۔ وہ سوسائٹی سے ان ہونی امیدیں قائم نہیں کرتے، وہ اس پر وہ بوجھ نہیں ڈالتے جو اس سے اٹھایا نہ جائے، وہ پہلے ایمان اور عقیدہ پیدا کرتے ہیں۔ اس کے اخلاق اور عمل کو سدھارتے ہیں۔ اسی طرح صحیح کریکٹر پیدا کرتے ہیں۔ اپنی خواہشات اور فائدوں کے خلاف کام کرنے کی طاقت پیدا کرتے ہیں۔ پھر جس طرح پھلدار اور بے روگ

درخت سے پھل پیدا ہوتے ہیں جس طرح آگ کے ساتھ گرمی اور سورج کے ساتھ روشنی ضروری ہے، اسی طرح صحیح کریکٹر اور صحیح تربیت سے آزادی حکومت کی صلاحیت، قربانی و خدمت کا جذبہ پیدا ہونا ضروری ہے۔ انسانی فطرت کا ہمیشہ سے یہی راستہ ہے ور ہمیشہ یہی راستہ رہے گا۔

یورپین سوسائٹی

یورپ میں چونکہ زندگی کی بہتر تنظیم اور شہریت کا احساس زیادہ ہے۔ اس لیے یورپین سوسائٹی کے افراد گھٹیا قسم کی بداخلاقیوں سے احتیاط کرتے ہیں، اور صرف اعلیٰ قسم کی بداخلاقیاں اور بلند معیار کی بے اصولیاں جائز سمجھتے ہیں، وہ افراد کے بجائے قوموں اور ملکوں کے معاملہ میں ناانصافیاں کرتے ہیں۔ انتخاب جیتنے کے لیے بڑی بڑی پارٹیوں اور قوموں کو اخلاقی رشوتیں دیتے ہیں، قوموں کو لڑا کر اور ملکوں کو تباہ کر کے اپنی تجارت کو فروغ دیتے ہیں۔ اگر موقع ہوتا ہے تو ایٹم بم کے استعمال کرنے اور ہرے بھرے شہروں کو خاک سیاہ کرنے سے بھی احتراز نہیں کرتے۔ ان کو اشخاص کے معاملہ میں ادنیٰ سی وعدہ خلافی سے تکلیف ہوتی ہے۔ مگر قوموں اور ملکوں کے معاملہ میں بڑی سے بڑی عہد شکنی میں تکلیف نہیں ہوتی۔ اگر دل سے خالی اور ضمیر سے عاری نظام تعلیم کسی قوم اور ملک کی اخلاقی سطح اونچا کر سکتا ہے تو اس وقت یورپ اور امریکہ شخصی اور اجتماعی اخلاق میں دنیا کے لیے نمونہ ہوتے۔

آنکھوں کی سوئیاں

زمانہ دراز سے مظلوم انسانیت کا جسم سوئیوں سے چھلنی ہو رہا ہے۔ کچھ ہمدرد ہاتھ اس کی سوئیاں نکالنے کے لیے بڑھتے ہیں، لیکن ہر مرتبہ آنکھوں کی سوئیاں چھوڑ دیتے ہیں۔ مبارک ہے وہ ہاتھ جو مظلوم انسانیت کے جسم کی سوئیاں نکالیں۔ مگر آنکھوں کی سوئیاں نکالے بغیر سکھ کی نیند اور دل کو چین حاصل نہیں ہو سکتا۔ انسانیت فریادی ہے کہ جسم کی سوئیوں کے ساتھ آنکھوں

کی سوئیاں بھی نکالی جائیں تاکہ اس کو حقیقی سکون اور دیرپا راحت نصیب ہو۔

ایک بڑی مصیبت

غلامی بھی انسانیت کے لیے ایک بڑی مصیبت اور بلائے جان ہے، اور اس کا دور کرنا زندگی کے حقیقی لطف سے متمتّع ہونے کے لیے شرط ہے۔

فرضی ضروریات

اگر دنیا کی اخلاقی تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا جائے، اور تعصبات سے الگ ہو کر بدنظمیوں، بے عنوانیوں، اور شہری زندگی کی مشکلات کے حقیقی اسباب تلاش کیے جائیں تو ان کی تہہ میں جائز انسانی خواہشات اور حقیقی ضروریات کا ہاتھ کم ملے گا۔ ان کی تہہ میں عموماً ناجائز خواہشات اور فرضی ضروریات نکلیں گی۔ انہیں ناجائز خواہشات اور فرضی ضروریات نے ہر زمانہ میں شہری زندگی میں نئی نئی الجھنیں اور ہر نظام حکومت کے لیے نئی نئی مشکلات پیدا کیے ہیں۔ انہیں فرضی ضروریات نے لوگوں کو مظالم، بددیانتی، غبن استحصال بالجبر، رشوت خوری، سٹہ بازی، ذخیرہ اندوزی، فریب دہی پر آمادہ کیا، اور ان کے اثر سے پورے پورے ملک اور بڑی بڑی حکومتیں ''اندھیر نگری چوپٹ راج'' بن کر رہ گئیں۔

اصل خرابی

موجودہ زندگی کی اصل خرابی یہ ہے کہ پوری سوسائٹی کا ضمیر خود غرض اور مطلب پرست بن گیا ہے۔ اس کا ایک فرد اپنی غرض کے لیے بے تکلف بڑی سے بڑی بے اصولی کا ارتکاب کر لیتا ہے۔ اگر وہ کسی شعبہ کا امین بنایا جاتا ہے تو اس کو خیانت میں باک نہیں، اگر کسی قومی ادارہ کا رکن منتخب ہوتا ہے تو اس کو خیانت میں باک نہیں۔ اگر کسی قومی ادارہ کا رکن منتخب ہوتا ہے تو اس کو اپنے حقیر فائدہ کے لیے بڑے سے بڑے قومی و جماعتی فوائد کو پامال کرنے اور دوسروں کا گھر اجاڑ

کر اپنا گھر آباد کرنے میں عذر نہیں۔ اگر وہ ماتحت ہے تو کام چور، سست کار اور احساس فرض سے عاری ہے وہ اپنے کسی متوقع فائدہ یا کسی ذاتی رنجش کی بناء پر ایک گھنٹہ کے کام میں بآسانی ایک مہینہ لگا سکتا ہے۔ اور آسان سے آسان۔ معاملہ کو برسوں الجھا سکتا ہے۔ اور اس طرح سے اپنے ذاتی فوائد کے لیے نظام حکومت کو ناکام یا بدنام کر سکتا ہے۔ اگر وہ صاحب اختیار ہے تو اعزہ نوازی احباب پروری، بیجا پاسداری، اور شخصی انا خاندانی فوائد کی بنا پر صریح بے اصولی کا ارتکاب کر کے ملک و قوم کو نقصان پہنچاتا ہے۔ اگر تاجر ہے تو دولت میں غیر ضروری اضافہ کرنے کے لیے چور بازاری اور ناجائز نفع خوری کر کے لاکھوں غریبوں کو پیٹ کی مار مارتا ہے۔ اور دانہ دانہ کو ترساتا ہے۔ اگر وہ روپیہ کا کاروبار کرتا ہے تو سود خوری اور مہاجنی کے ذریعہ صدہا غریبوں کا بال بال قرض میں جکڑ دیتا ہے، اور ان کو پیسہ پیسہ کا محتاج بنا دیتا ہے۔

خود غرضی کا شیطان

افراد سے بڑھ کر جماعتوں اور پوری پوری قوموں پر خود مطلبی اور خود غرضی کا شیطان مسلط ہو گیا ہے۔ سیاسی جماعتیں جماعتی خود غرضی اور خود بینی میں مبتلا ہیں۔ یورپ اور امریکہ کی جمہوریتوں پر قومی خود غرضی کا بھوت سوار ہے۔ جس کے پاؤں کے نیچے چھوٹی اور کمزور قومیں سبزہ کی طرح پامال ہوتی رہتی ہے۔ اس قومی خود غرضی نے ساری دنیا کو تجارت کی منڈی یا لوہار کی بھٹی بنا رکھا ہے۔ اور ساری زمین کو ایک وسیع میدان جنگ میں تبدیل کر دیا ہے۔ اس قومی خود غرضی کے خاطر بڑی سے بڑی بے اصولی اور بے آئینی روا ہے۔ اس کے ادنیٰ اشارے پر لاکھوں بے گناہ انسانوں کو بے دریغ موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔ ایک قوم پر دوسری قوم کو مسلط کر دیا جاتا ہے۔ بھیڑ بکریوں کی طرح ایک قوم کو دوسری قوم کے ہاتھ بیچ ڈالا جاتا ہے۔ متحد ملک کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جاتے ہیں۔ یورپ کی اسی قومی خود غرضی نے پہلے عربوں کو ترکوں کے خلاف ابھارا، اور کل عرب سلطنت کا خواب دکھایا۔ پھر اسی خود غرضی نے شام جیسے چھوٹے

ملک میں چار مستقل حکومتیں قائم کیں۔ پھر اس نے یہودیوں کو وطن الیہود کا سبز باغ دکھایا۔ آج بھی فلسطین میں جو کچھ ہو رہا ہے اور اس کی گتھی جس طرح الجھتی جا رہی ہے وہ محض امریکہ برطانیہ اور روس کی قومی خود غرضی کا نتیجہ ہے۔ ہندوستان میں سو برس جو کچھ ہوتا رہا ہے اور پھر آخر میں جس طرح اس امن پسند ملک کو قتل گاہ بنا کر چھوڑا گیا ہے وہ یا تو برطانیہ کی براہ راست قومی خود غرضی کا سرچشمہ ہے۔ اس کی پیدا کی ہوئی اس بدترین قومی خود غرضی کا جس کا زہر یہاں کی آبادی کے جسم میں سو برس تک سرایت کرتا رہا۔ مغربی تہذیب اور مغربی سیاست کی لائی ہوئی اس قومی خود غرضی نے ۴۷ء میں یہاں کے لوگوں کو اتنا اندھا اور دیوانہ بنا دیا کہ ان سے وہ غیر انسانی افعال صادر ہوئے جن کی نسبت سے چوپایوں اور درندوں کو بھی شرم آئے گی۔ اور آدم خور وحشیوں کی گردن شرم سے جھک جائے گی اور زمانہ آئندہ کا مورخ ان واقعات کی تصدیق میں سخت پس و پیش کرے گا۔

آج کے انسان کا خاصہ

پھر اس خود غرضی نے ساری دنیا میں اور ملک کے تمام طبقوں میں ایک مخصوص مزاج پیدا کر دیا ہے۔ جس کا خاصہ ہے کہ انسان اپنے حقوق کے مطالبہ میں بڑا مستعد ہے، اور فرائض و حقوق کے ادا کرنے میں سخت کوتاہ اور حیلہ جو، اس ذہنیت اور سیرت نے ساری دنیا میں انفرادی جماعتی اور طبقاتی کشمکش برپا کر دی ہے۔ ہر شخص اپنا حق مانگتا ہے اور دوسرے کا حق ادا کرنے سے گریز کرتا ہے۔ اگر دنیا پر نظر ڈالی جائے تو ساری دنیا حقوق طلبوں کی ایک آبادی نظر آئے گی، جس میں حق طلبی کا نعرہ تو ہر زبان پر ہے لیکن ادائے فرض کا احساس کسی دل میں نہیں۔ جس آبادی میں ہر شخص حق طلب ہو لیکن فرض شناس کوئی نہ ہو، وہاں کی زندگی کی الجھنوں اور دقتوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، اور وہاں کی کشمکش کو کوئی انسانی تدبیر یا تنظیم دور نہیں ہو سکتی۔

سیاست کا جنم روگ

یہ خود غرضی اور مطلب پرستی اس موجودہ نظام معاشرت و سیاست کا جنم روگ ہے۔ جب تک اس کا ازالہ نہ ہو، ظاہری انتظامات اصلاحات و ترقیات کچھ زیادہ نتیجہ خیز نہیں سیاسی طور پر ملک آزاد خود مختار ہو یا غیر ملکی حکومت کے ماتحت جب تک ہماری سوسائٹی پر خود غرضی مسلط ہے دولت و عزت کا عشق تمام ملک پر چھایا ہوا ہے۔ ذمہ داری کا احساس افراد کے دلوں سے نکل چکا ہے۔ اور معاشرہ کا قلبی رجحان زیادہ سے زیادہ لطف اندوزی، فرضی ضروریات کے حصول اور خواہشات نفس کی تکمیل کی طرف ہے۔ عملاوہ سوسائٹی زندگی کی حقیقی مسرتوں اور آزادی کے عملی نتائج سے محروم رہے گی۔

مقاصد کی صحت

مقاصد کی صحت رجحان کی درستی اور انصاف و ہمدردی کے قلبی جذبات کا سرچشمہ ایک صحیح و طاقتور اخلاقی و روحانی مذہب ہی ہے جو انسان کے جسم کے ساتھ اس کے دل پر بھی حکومت کرے۔ جو اس کی خواہشات کو اپنے ضبط و نظم میں رکھے جو اپنی روحانی طاقت سے اس سے بنی نوع کے حق میں ایثار زبانی کرا سکے جو اس محدود و مختصر زندگی کے علاوہ کسی ایسی غیر فانی زندگی کو اس کی نگاہ میں اس طرح حقیقت بنا سکے کہ اس کے شوق میں آدمی اس زندگی میں اعتدال و احتیاط سے کام لے۔ جو اس کے سامنے کھانے پینے، پہننے اوڑھنے، دولت و عزت حاصل کرنے اور حیوانی تقاضوں کو انسانی عقل ہنر مندی سے پورا کرنے کے علاوہ انسانیت اور زندگی کے کچھ اور معانی بتلا سکے اور انسان کی زندگی کے کچھ زیادہ بلند مقاصد انسان کے سامنے لا سکے۔ ایسے ہی مذہب کی صحیح تعلیم اس خود غرضی اور کوتاہ نظری کو زائل کر سکتی ہے، جس سے ہمارا موجودہ نظام معاشرت و سیاست داغ داغ ہو رہا ہے۔

دنیا کی سالگرہ

ہر ایک کو اپنی سالگرہ عزیز ہے۔ ہماری اس موجودہ دنیا کی بھی ایک سالگرہ ہے اور وہ آج کا مبارک دن ہے۔ کہ آج کے دن دنیا کا سب سے مبارک انسان پیدا ہوا، جس نے اس دنیا کو نیا ایمان اور نئی زندگی بخشی اور ساری دنیا کو علم و یقین امن و تہذیب روحانیت اور خدا کے ذکر سے بھر دیا۔

صورت و حقیقت

آپ تاریخ اسلام میں مسلمانوں کی ناکامی کی تلخ داستانیں پڑھتے ہیں یہ حقیقت کی شکست کے واقعات نہیں یہ سب صورت کی شکست و ہزیمت کے واقعات ہیں۔ صورت نے ہمیں ہر معرکہ میں رسوا و ذلیل کیا ہے۔ لیکن خطا ہماری تھی ہم نے غریب صورت پر حقیقت کا بوجھ رکھنا چاہا وہ اس بوجھ کو سہار نہ سکی، خود بھی گری اور عمارت کو بھی زمین پر لے آئی۔

حقیقت اسلام میں آج بھی طاقت ہے

حقیقت اسلام اور حقیقت ایمان میں آج بھی وہی طاقت ہے جو ابتدائے اسلام میں تھی۔ آج بھی اس کے وہ تمام واقعات ظاہر ہو سکتے ہیں جو اس سے پہلے ظاہر ہوئے ہیں، آج بھی اس کے سامنے دریا پایاب ہو سکتے ہیں۔ سمندر میں گھوڑے ڈالے جا سکتے ہیں، درندے جنگل چھوڑ کے جا سکتے ہیں، بھڑکتی ہوئی آگ گلزار بن سکتی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ حقیقت ابراہیمی موجود ہو۔

آج بھی ہو جو ابراہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

انسان کی تلاش

آج جس انسان کو طالب خدا ہونا چاہیے تھا، اس کی معرفت اور محبت سے اپنا ویران دل آباد، اپنا اندھیرہ دماغ روشن، اپنی بے مقصد و بے کیف زندگی بامقصد اور پر کیف بنانے چاہیے تھی۔ صد حیف کہ وہ انسان حقیقی محبت، صحیح معرفت سے محروم ہے۔ اس لیے زندگی کی اصل لذت سے محروم ہے اور حقیقی انسانیت سے محروم ہے اور افسوس ہے کہ لاکھوں کروڑوں انسانوں کو اس محرومی کا احساس بھی نہیں۔

انسانیت کی ترقی

انسانیت کی ترقی ان مادی ترقیات کا نام نہیں ہے، اور محض نسل انسانی کی ترقی کو انسانیت کی ترقی نہیں کہا جاسکتا۔ انسانیت کی ترقی کا اندازہ انسانوں کے اخلاق و کردار سے ہوتا ہے اور اخلاق و کردار کا اندازہ آپس میں ملنے جلنے، ریل کے ڈبوں، پارکوں، ہوٹلوں، دفتروں اور بازاروں میں ہو سکتا ہے۔ اردو کے مشہور شاعر اکبر نے بالکل صحیح کہا ہے۔

نقشوں کو تم نہ جانچو، لوگوں سے مل کے دیکھو
کیا چیز جی رہی ہے کیا چیز مر رہی ہے

خم ٹھونک کر کہتا ہوں

میں (علامہ ندوی) سارے یورپ سے خم ٹھونک کر کہتا ہوں کہ تمہارا پورا نظام زندگی غلط ہے، اور وہ انسانیت کو ہلاکت کی طرف لے جارہا ہے۔ میرا دعویٰ ہے، پورے استدلال اور یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ دنیا کی نجات پیغمبروں ہی کے راستہ میں ہے اور دنیا کے لیے اس وقت خدا کے یقین اس کے خوف دوسری زندگی پر ایمان اور پیغمبروں کی رسالت کا اقرار کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ یہی ہماری دعوت ہے اور یہی ہماری جدوجہد کا مقصد۔

ان کا جو فرض ہے وہ اہل سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

تعلقات کا چسکہ

تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں مولانا محمد یحییٰ صاحب کے یہاں سب سے زیادہ زور ترک تعلقات پر تھا۔ ان کا مقولہ تھا کہ ''آدمی چاہے کتنا غبی اور کند ذہن ہو اگر اس میں تعلقات کا مرض نہیں تو وہ کسی وقت ذی استعداد بن کر رہتا ہے، اس کے بر خلاف وہ جتنا بھی ذی استعداد ذہین اور علم کا شوقین ہو، اگر اس کو تعلقات کا چسکہ ہے تو وہ اپنے جوہروں کو کھو کر رہے گا۔

ایک مخلصانہ نصیحت

''میری (شیخ الحدیث مولانا زکریا رحمۃ اللہ علیہ) ایک نصیحت بہت غور سے سنو ہمیشہ ایسی چیزوں پر لب کشائی کرو جس کے پورے مالہ و ماعلیہ پر عبور ہو، دو شخصوں کے درمیان میں مکالمہ جب ہی ممکن ہو سکتا ہے جب ان دونوں کے پورے دلائل پر عبور ہو البتہ کسی شرعی منصوص کے خلاف کوئی چیز ہو تو اس میں کسی کی بھی رعایت نہیں کہ اللہ اور اس کے رسول کے خلاف کوئی قول معتبر نہیں بلکہ فقہاء سلف کے منصوص اقوال کے خلاف بھی مقلد کیلئے کوئی گنجائش نہیں۔ لیکن جہاں مسئلہ استنباط سے تعلق رکھتا ہو نصوص شرعیہ ہر ایک کے ساتھ ہو وہاں جلدی سے دخل در معقولات کر کے فوراً مکالمہ کر دینا حماقت ہے۔ میں تم کو بڑے زور سے کہتا ہوں کہ اہل حق پر انکار کرنے میں کبھی جلدی نہ کرنا، بہت غور و فکر اور تدبر کے بعد لب کشائی کرنا جہاں تک ممکن ہو اس سے گریز کرنا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ جن کو عمر ثانی کہا جاتا ہے انہوں نے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی آپس کی لڑائی میں کس قدر بہترین فیصلہ کیا:

تلك دماء طهر الله أيدينا منها فلا نلوث ألسنتنا بها.

ان خونوں سے اللہ جل شانہ نے ہمارے ہاتھوں کو پاک رکھا تو ہم اپنی زبانوں کو کیوں اس سے آلودہ کریں۔

اگر یہ کہا جائے کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی شان اعلیٰ و ارفع ہے، دوسروں کا ان پر کیسے قیاس کیا جاسکتا ہے تو میں کہوں گا کہ وہاں لب کشائی سے بچنے والے بھی حضرت عمر بن عبدالعزیز ہے جو جلیل القدر تابعی ہیں۔ حضرت خضر، حضرت موسیٰ علی نبینا و علیہم السلام کا قصہ مشہور ہے۔ قرآن پاک میں مفصل مذکور ہے۔ متعدد احادیث میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد وارد ہوا ہے کہ اللہ جل شانہ، حضرت موسیٰ علی نبینا علیہ الصلوۃ والسلام پر رحم فرمائے اگر وہ سکوت کرتے تو اور بھی عجائبات حضرت خضرت کے کارناموں کے معلوم ہوتے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مقولہ ہے۔امور تین طرح کے ہوتے ہیں ایک وہ جن کا رشد و ہدایت کھلا ہوا ہوان کا اتباع کرو دوسرے وہ امور ہے جن کا گمراہی ہونا کھلا ہوا ہوان سے اجتناب کرو تیسرے وہ ہے جن میں اختلاف ہوان کو ان کے عالم کے حوالے کرو۔ رواہ الطبرانی ورجالہ موثقون مجمع الزوائد۔

حضور اقدس علیہ الصلوۃ والسلام کا ارشاد ہے جو شخص فتاوی دینے پر زیادہ جری ہے وہ جہنم پر زیادہ جری ہے۔ (دارمی) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے ہیں کہ جو شخص ہر استفتاء کا جواب دے وہ مجنون ہے۔ (دارمی)

مسلمان کی غیبت اور آبروریزی

"اللہ کا راستہ صرف جہاد میں یا نوافل میں یا دوسری عبادات میں منحصر نہیں بلکہ ضروری اعمال و عبادات کرنے کے بعد جو کام بھی نیک نیتی سے کیا جائے اللہ کی رضا اس میں مقصود ہو، ادائے حقوق اس کی غرض ہو، وہ سب اللہ ہی کا راستہ ہے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ دینداری صرف عبادات میں مشغولی کا نام ہے اور دنیا داری کے کاموں میں مشغول ہونا اس کے منافی

ہے وہ غلطی پر ہیں۔ معتبر علماء میں سے کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ اسباب معیشت کو حاصل نہ کیا جائے یا ترک کر دیا جائے البتہ یہ ضرور ہے کہ ان کو دنیا کی غرض سے نہ کیا جائے ان کو بھی اللہ ہی کی رضا کے واسطے اس کے مقرر کیے ہوئے حقوق کے واسطے حاصل کیا جائے۔ وجاہت تفاخر تکبر اور لوگوں کی نگاہ میں بڑائی حاصل کرنے کے واسطے نہ کیا جائے مگر اس سب کے باوجود دوسری جانب بھی قابل لحاظ ہے وہ یہ کہ ہر شخص کو صاحب غرض سمجھنا یہ بھی اسلامی تعلیم کے منافی ہے۔ اللہ جل جلالہ کا ارشاد ہے ﴿يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۫ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّ لَا تَجَسَّسُوْا وَ لَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا﴾۔ (سورہ حجرات رکوع ۲) اے ایمان والو بہت سے گمانوں سے بچا کرو اس لیے کہ بعضے گمان گناہ ہوتے ہیں اور (کسی کے عیب کا) تجسس بھی نہ کیا کرو اور کوئی کسی کی غیبت بھی نہ کیا کرے۔ ہم لوگوں کی عام حالت یہ ہے کہ جو شخص ہماری مرضی کے موافق کام کرتا ہے وہ مخلص ہے متقی ہے پرہیز گار ہے لیکن جوں ہی وہ ہماری رائے کے خلاف کوئی کام کر گزرتا ہے وہ ٹوڈی ہے۔ انگریز پرست ہے، یا ہندو پرست ہے، خود غرض ہے نفس پرست ہے، غدار قوم ہے، مکار ہے، دغا باز ہے وہ انگریزوں کا وظیفہ خوار ہے، یا کانگریس کا تنخواہ دار ہے۔ غرض یہ کہ دنیا بھر کے عیوب اس میں جمع ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو شخص مسلمان کی عیب پوشی کرتا ہے حق تعالیٰ شانہٗ قیامت میں اس کی عیب پوشی کریں گے۔ اور جو شخص مسلمان کی پردہ داری کرتا ہے حق تعالیٰ شانہٗ اس کی پردہ داری کرتے ہیں، حتیٰ کہ وہ اپنے گھر میں (چھپ کر) کوئی عیب کرتا ہے تو تب بھی اس کو فضیحت کرتے ہیں۔

بقائے باہم کے لیے ضروری ہے

دنیا میں مختلف قوموں، فرقوں اور آبادی کے مختلف عناصر کے اتحاد و اعتماد، محبت و عزت اور تعاون و اشتراک کے ساتھ رہنے اور بقائے باہم (Co-Existence) کے لیے ضروری

ہے کہ ہر قوم دوسری قوم کے مزاج و فراق، عقائد و روایات، اجتماعی سیرت و کردار، اس کے ماضی اور اس کی تاریخ اس کے علمی و تمدنی کارناموں اور اس کی تعمیری اور تخلیقی صلاحیتوں سے نہ صرف واقف ہو بلکہ ان کا احترام اور ان کی قدر بھی کرتی ہو، ان کے ساتھ ہمدردی بھی رکھتی ہو، اور ان کو ایک قابل قدر، قابل حفاظت دولت سمجھتی ہو۔

بیرونی فتح کا ایک فائدہ

بیرونی فتح خواہ کچھ بھی برائیاں لے کر آئے اس کا ایک فائدہ ضرور ہوتا ہے۔ یہ عوام کے ذہنی افق میں وسعت پیدا کر دیتی ہے، اور انہیں مجبور کر دیتی ہے کہ وہ اپنے ذہنی حصار سے باہر نکلیں وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ دنیا اس سے کہیں زیادہ بڑی اور بوقلموں ہے جیسی کہ وہ سمجھ رہے تھے۔

عربی ادب اور علمائے ہند

عربی زبان و ادب سے شدید تعلق شروع ہی سے مسلمانان ہند کا خاصہ رہا ہے۔ چنانچہ انہوں نے تصنیف و تالیف اور علم و ادب کی زبان کی حیثیت سے اس زبان کی ہمیشہ حفاظت کی ہے۔ یہاں عربی کے خوش گو پر گو اور مغز بیان شعراء پیدا ہوئے مثلاً قاضی عبدالمقتدر کندی دہلوی (م۷۹۱ء) شیخ احمد بن محمد تھانیسری (م۸۲۰ھ) مولانا غلام علی آزاد بلگرامی صاحب سبع پارہ (م۲۰۰ھ) مفتی صدر الدین دہلوی (م۱۲۸۵ھ) مولانا فیض الحسن سہارنپوری (م۱۳۰۴ھ) مولانا ذوالفقار علی دیوبندی (م۱۳۲۲ھ) اور مفتی محمد عباس لکھنوی (م۱۳۰۶ھ) ادباء و محققین عرب نے پروفیسر عبدالعزیز میمن اور مولانا محمد سورتی کی عربی دانی، عربی لغت اور نحو پر ان کی گہری نظر اور علمیت کا لوہا مانا اور عربی زبان کی سب سے مفصل و مستند لغت لسان العرب کی تصحیح کی کمیٹی میں مولانا عبدالعزیز میمن کو شریک کر کے ان کے علمی استناد و امتیاز کا اعتراف کیا، ان کی ایڈٹ کی ہوئی کتاب سمط اللالی اور ان کی تالیف ابوالعلاء و ماالیہ سے ان کی وسیع اور گہری نظر کا

اندازہ ہوتا ہے۔

عربی کے جدید انشاء پرداز

علاوہ ازیں دارالعلوم ندوۃ العلماء نے عربی ادیبوں اور انشاء پردازوں کی ایک ایسی جماعت تیار کردی ہے جس کی ادبی سرگرمیاں اور علمی خدمات ہندوستان کے حدود سے متجاوز ہوکر ممالک عربیہ اور بلاد اسلامیہ تک پہنچ چکی ہیں۔ عالم اسلام کی ادبی تحریکات اور مختلف مکاتب فکر کا جائزہ لیتے وقت عربی ادب کا ایک بے لاگ اور وسیع النظر مؤرخ ہمارے ان ندوی ادباء کی شگفتہ و پختہ تحریروں اور ایسے اسلوب کو نظر انداز نہیں کرسکتا جس میں ادبی حلاوت اور دعوتی و ایمانی روح اور قوت کا نہایت خوشگوار اور دل آویز امتزاج ہے، اور جنہوں نے اپنا ایک علیحدہ اسلوب پیدا کرلیا ہے۔ جس میں کلاسیکی ادب کی پختگی اور ثقافت اور جدید ادب کی برجستگی اور سلاست جمع ہے۔

غیر معمولی صلاحیتوں والی شخصیت

کسی قوم کی تاریخ میں وقتاً فوقتاً ایسی شخصیتوں کا وجود میں آتے رہنا جو زندگی کے مختلف شعبوں اور علم و ادب کی مختلف شاخوں میں غیر معمولی صلاحیتوں کی حامل ہوں۔ قوم کی زندگی نجابت اور اس بات کا زندہ ثبوت ہوتا ہے کہ اس قوم کو زندہ رہنے کا استحقاق حاصل ہے اور اس کی زندگی اور ذہانت کا سوتا خشک نہیں ہوا ہے۔

ایک تہذیب کا دوسری تہذیب پر اثر

حقیقت یہ ہے کہ کسی تہذیب کا دوسری تہذیب پر صرف اثرانداز ہونا اور اثرپذیر نہ ہونا تاریخ عالم کا ایک نادر واقعہ ہے۔ یہ نہ انسان کی فطرت کے مطابق ہے نہ مصلحت کے، انسانی زندگی قبول و عطا کے شریفانہ اصول کی قائل ہے اور اسی میں اس کا نمو اور ارتقاء اور اس کی وسعت اور رنگارنگی کا راز پنہاں ہے۔

اخلاص وایثار

قدیم اساتذہ کا سب سے بڑا امتیاز اور ان کا شعار ان کا اخلاص وایثار تھا، چونکہ تعلیم وتعلم کا اخروی ثواب اور استاد و معلم کی دینی فضیلت ان کے ذہن پر نقش تھی، اور ان کا عقیدہ اور جز ایمان بن چکی تھی۔ اس لیے اگر ان میں سب نہیں تو بہت بڑی تعداد محض رضائے الٰہی اور حصول اجر وثواب کے لیے تعلیم وتعلم میں مشغول تھی اور اس کو افضل عبادت اور اعلیٰ سعادت سمجھتی تھی۔ ان اساتذہ میں بہت سے حضرات زہد وقناعت کے ساتھ بسر کرتے تھے۔ اور فقر و فاقہ میں زندگی گزارتے تھے۔ علمائے ہند کے تذکرے کی قدیم کتابوں میں ان اساتذہ کبار کے زہد وایثار اور فقر وفاقہ کے بڑے مؤثر اور دلدوز واقعات ملتے ہیں۔ یہاں ایک واقعہ نقل کیا جاتا ہے۔

مؤرخ ہند مولانا غلام علی آزاد بلگرامی ''ماثر الکرام'' میں بلگرام کے مشہور محدث اور استاد میر سید مبارک متوفی ۱۱۱۵ھ کا ایک واقعہ اپنے استاد میر طفیل محمد بلگرامی کی زبانی بیان کرتے ہیں۔

''ایک روز میں میر سید مبارک کی خدمت میں حاضر ہوا آپ وضو کی تیاری کے لیے کھڑے ہوئے تھے کہ لڑکھڑا کر گرے، میں نے لپک کر سنبھالا اور اٹھایا، کچھ دیر کے بعد ہوش آیا تو میں نے سبب دریافت کیا بہت پوچھنے اور سخت اصرار کے بعد فرمایا کہ تین روز ہوئے ایک دانہ منہ میں نہیں گیا میر صاحب نے اس عرصہ نہ کسی سے اس کا اظہار کیا نہ کسی سے کچھ قبول کیا۔ یہ سن کر مجھے بڑی رقت ہوئی فوراً اپنے مکان گیا اور استاد کی مرغوب غذا تیار کروا کر لایا پہلے تو بڑی بشاشت اور محبت کا اظہار فرمایا اور دعا دی پھر فرمایا کہ اگر برا نہ مانو تو ایک بات کہوں؟ میں نے عرض کیا ارشاد ہو! فرمایا کہ ایسے کھانے کو صوفیوں کی اصطلاح میں ''طعام اشراف'' کہتے ہیں اگرچہ فقہ کی مدد سے ایسا کھانا جائز ہے اور تین روز کے بعد شریعت میں مردار کا کھانا بھی جائز ہو جاتا ہے۔ لیکن طریق فقر میں طعام اشراف کا کھانا جائز نہیں میں نے جب یہ ارشاد سنا تو بے کچھ کہے سنے مجلس

سے اٹھا اور کھانا باہر اٹھا لایا کچھ دیر دروازے کے باہر کھڑا رہا۔ پھر کھانا واپس لے آیا اور عرض کیا کہ جب میں کھانا اٹھا کر باہر لے گیا تو کیا حضرت کو اس کی واپسی کی توقع تھی؟ فرمایا نہیں، میں نے عرض کیا اب تو یہ کھانا خلاف توقع آیا ہے اب یہ "طعام اشراف نہیں رہا۔ حضرت کو میری اس تاویل سے بہت لطف آیا اور فرمایا کہ تم نے عجب ذہانت سے کام لیا پھر رغبت ساتھ تناول فرمایا۔"

یہ واقعہ اگرچہ اپنی نوعیت میں نرالا اور غیر معمولی ہے مگر ہندوستان کی تعلیمی و دینی تاریخ میں اساتذہ کے ایثار اخلاص زہد و قناعت اور فقر و فاقہ کے اتنے واقعات درج ہیں کہ وہ اس نظام تعلیم و تربیت کی ایک روایت بن گئی ہے۔

۳۔ اساتذہ کے اخلاص و ایثار کا ایک دوسرا واقعہ بھی جو ایک صدی بعد کا ہے کچھ کم حیرت انگیز نہیں۔ مولانا عبدالرحیم صاحب (م ۱۲۳۴ھ) رام پور میں درس دیتے تھے روہیل کھنڈ کے انگریز حاکم مسٹر ہاکس نے ان کو بریلی کالج کی تدریس کے لیے ڈھائی سو روپیہ مشاہرہ کی جو ۱۸۵۷ء سے پہلے وہ حیثیت رکھتا تھا جو اس وقت ہزار بارہ سو کی بھی نہیں، پیش کش کی اور وعدہ کیا کہ تھوڑی مدت میں اس مشاہرہ میں اضافہ اور ترقی ہو جائے گی۔ انھوں نے عذر کیا کہ ریاست سے ان کو دس روپے ماہوار ملتے ہیں وہ بند ہو جائیں گے۔ ہاکنس نے کہا میں تو اس وظیفہ سے پچیس گناہ پیش کرتا ہوں، اس کے مقابلے میں اس حقیر رقم کی کیا حیثیت ہے۔ انہوں نے عذر کیا کہ میرے گھر میں بیری کا ایک درخت ہے اس کی بیری بہت میٹھی اور مجھے مرغوب ہے۔ بریلی میں وہ بیری کھانے کو نہیں ملے گی۔ ظاہر میں انگریز اب بھی ان کی دل کی بات پا نہ سکا، اس نے کہا رام پور سے آنے کا انتظام ہو سکتا ہے۔ آپ بریلی میں گھر بیٹھے اپنے درخت بیری کھا سکتے ہیں۔ مولانا نے فرمایا کہ ایک بات یہ بھی ہے کہ میرے طالب علم جو رام پور میں درس لیتے ہیں ان کا درس بند ہو جائے گا، اور میں ان کی خدمت سے محروم ہو جاؤں گا، انگریز کی منطق نے اب بھی ہار نہیں مانتی۔ اس نے کہا کہ میں ان کے وظائف مقرر کرتا ہوں وہ بریلی میں آپ سے اپنی تعلیم جاری

رکھیں اور اپنی تکمیل کریں آخر اس مسلمان عالم نے اپنی کمان کا آخر تیر یہ چھوڑا، جس کا انگریز کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ مولانا نے فرمایا کہ یہ سب صحیح ہے لیکن تعلیم پر اجرت لینے کے متعلق میں قیامت میں اللہ کو کیا جواب دوں گا۔

مشکلات اور آزمائشیں

دنیا کی ہر قوم مشکلات اور آزمائشوں کے دور سے گزرتی ہے۔ راہ کی یہ دشواریاں اور وقت کی آزمائشیں اس کی صلاحیت بقاء کی کسوٹی ہوتی ہیں۔ اس کی خداداد صلاحیتوں اور چھپی ہوئی طاقتوں کو جلا بخشتی ہیں۔ قوموں کی زندگی میں پیچیدگیاں اور مشکلات "آب نشاط انگیز" کا اثر رکھتی ہیں اور ترقی و کامرانی کے سفر میں مہمیز کا کام دیتی ہیں۔ جو قومیں کبھی مشکلات و مصائب سے دوچار نہیں ہوئیں ان کے اندر نہ تو اصلاح حال کی امنگ ہوتی ہے نہ خود اعتمادی کا جوہر، بلکہ رفتہ رفتہ وہ تن آسانی خود فراموشی اور جمود کا شکار ہو کر صفحۂ ہستی سے ناپید ہو جاتی ہیں۔

مسلمانوں کا اقتصادی مسئلہ

فلسفہ تاریخ اور قوموں کے عروج و زوال کی داستان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ معاشی حالت قوموں کی فکری و ذہنی حالت اور صحت میں بڑی حد تک اثرانداز ہوتی ہے۔ جو قوم معاشی مشکلات اور فقر و فاقہ اور اس کے نتیجہ میں غذائی بدحالی، مواقع ترقی سے محرومی، مستقبل سے مایوسی، کم ہمتی اور ملک کی اہم ذمہ داریوں سے محرومی کا شکار ہوتی ہے، وہ ترقی یافتہ اور بلند ہمت قوموں کی صف سے خارج ہو کر پسماندہ اور ذلیل اور کم ہمت قوموں کی برادری میں داخل ہو جاتی ہے۔ اس کی ذہنی و فکری صلاحیت اور دماغی اپاہج ہو کر رہ جاتی ہے۔

صدیوں کے بعد

شاعر اپنی ذہانت اور قوت متخیلہ سے بہت سے ایسے مضامین بیان کر دیتے ہیں جن کا

اصل مصداق ابھی تک پیدا ہی نہیں ہوا۔ وہ اپنی طباعی اور مضمون آفرینی سے بعض باتیں کہہ جاتے ہیں۔ بعض مرتبہ برسوں کے بعد بعض مرتبہ صدیوں کے بعد وہ وقت آتا ہے جب اس شعر کی صحیح تشریح ہوتی ہے اور اس میں جان پڑتی ہے۔

قربانی مقدس چیز

قربانی تو وہ چیز ہے کہ اس کو سنتے ہی بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں لیکن ہم قربانی کا لفظ جب استعمال کرتے ہیں تو ملازمت کی قربانی کو تنخواہ کی معمولی قربانی کو اس کا مصداق سمجھتے ہیں۔ لیکن قربانی وہ باعظمت اور مقدس چیز ہے جس کی تاریخ ابراہیم علیہ السلام کی قربانی پر ختم ہوتی ہے۔ ہر چیز کا شجرہ نسب ہوتا ہے۔ مسجد کا شجرہ نسب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بنائی ہوئی مسجد کعبۃ بیت اللہ سے ملتا ہے، اور جس مسجد کا نسب مسجد ابراہیمی پر جا کر ختم نہ ہو وہ مسجد خانہ خدا کہلانے کی مستحق نہیں، وہ مسجد ضرار ہے۔ اور جس مدرسہ کا شجرہ نسب صفہ نبوی پر ختم نہ ہو وہ مدرسہ دانشکدہ نہیں، جہالت کدہ ہے تو اسی طرح میں (علامہ ندوی) کہوں گا کہ جس قربانی کا شجرہ نسب ابراہیم خلیل اللہ کے جذبہ ایثار و حب خدا اور حضرت اسماعیل ذبیح اللہ کی بے نفسی و تسلیم و رضا پر ختم نہ ہو وہ صحیح النسب نہیں ہے۔

سلطنت عثمانیہ کے بعد

سلطنت عثمانیہ کے بعد عالم اسلام کا کوئی ملک اور ملت اسلامیہ کا کوئی کنبہ کوئی خاندان اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ عالم اسلامی کے کس مسئلہ میں اپنا سیاسی وزن ڈال سکے۔

ذرا سی لسانی عصبیت

آپ سب جماعتی مفاد سے بالاتر ہو کر صورت حال کا مقابلہ کریں، زمانہ کو چیلنج کے قبول کریں اور اس کا ہمت و جرأت سے سامنا کریں اور اگر خدا کی طرف سے کوئی موقع ملا ہو تو آپ اس

موقع سے فائدہ اٹھائیں اگر کوئی فرد کوئی جماعت دس فیصد بھی اپنے کو اس کا اہل قرار دے کہ وہ آپ کی کوئی خدمت کر سکے تو اخلاص کا تقاضا یہ ہے کہ اسے موقع دیں کہ وہ اپنی صلاحیت کا اظہار کرے۔ مسلمانوں کی تقدیر کی یہ جو لکیریں ہیں ان کو سامنے رکھئے یہ نوشتہ دیوار نہیں نوشتہ تقدیر ہے۔ آپ کی ذرا سی غلطی ذرا سی نفسانیت ذرا سی صوبائی یا لسانی یا طبقہ واری عصبیت آپس کا انتشار واختلاف مسلمانان عالم کے لیے نقصان دہ ہو سکتا ہے۔ آج یا کل جب بھی موقع آجائے تو آپ سارے مفادات پر ملت کے مفاد کو مقدم رکھیں اور آپ ہر اس موقع سے ہر اس موضوع سے، اس مسئلہ سے کنارہ کشی اختیار کریں جو کسی قسم کا ذہنی انتشار پھیلائے۔ اگر اس کے لیے آپ کو اختلافی مسائل کو کچھ دنوں کے لیے بالائے طاق رکھنا پڑے تو ضرور رکھیں۔ فرض اور واجب ہے کہ آپ غیر ضروری بحثوں کو نہ چھیڑیں اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر بعض دینی دعوتوں نے شروع سے یہ احتیاط برتی ہوتی، اور انہوں نے جانبی اور ذیلی بحثوں کو کچھ دنوں کے لیے اٹھا رکھا ہوتا تو آج ان کے لیے راستہ اس سے زیادہ صاف تھا۔ جتنا اس وقت آپ کو نظر آرہا ہے۔ لیکن بہر حال یہ انسانی کوششیں ہیں انسان اپنے علم اور عقل کا مکلف ہے۔

تہذیب وثقافت

تہذیب وثقافت کے معنی یہ ہیں کہ غلط فہمیاں رفع ہوں، آدمی کو آدمی سمجھے۔ اس کے ساتھ انصاف کرے، اس کی مجبوریاں معلوم کرے، اس کی کمزوریاں معلوم کرے، اس کے لیے اپنے دل میں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو، اس کے ادب وشاعری سے واقفیت کا ذوق پیدا ہو۔ تہذیب و ثقافت کی وحدت کے اندر جارحیت کا پہلو اور اس کے اندر انسانوں کو ذلیل کرنے یا انسانی تہذیب کے خلاف حملہ آور ہونے کا پہلو تو ہونا ہی نہیں چاہیے تھا۔

تھوڑے فاصلہ پر

تھوڑے فاصلہ پر زبان بدل جاتی ہے، اور اس میں پھر وہ عصبیت پیدا ہو جاتی ہے جو مستقل

دو زبانوں کے بولنے والوں کے درمیان ہوتی ہے۔

زبان کی وحدت کے تباہ کن نتائج

یہ زبان جو بڑی معصوم چیز ہے، جس سے پھول جھڑتے ہیں، یہ زبان جو دلوں کو ملانے کے لیے دل کو خوش کرنے کے لیے محبت کے گیت سنانے کے لئے، انسان کو قریب کرنے کے لئے، اس کو آواز دینے کے لیے ہے، یہ زبان جو جذبات محبت کی ترجمانی کے لیے استعمال کی گئی۔ رازہائے فطرت کو عیاں کرنے کے لیے استعمال کی گئی۔ یہ زبان جس نے بارہا انسان کو مست کر دیا بچھڑے ہوؤں کو ملا دیا، ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑ دیا، جس نے محبت کے دریا بہائے، یہی زبان لاکھوں انسانوں کی بربادی کا باعث ہوئی ہے۔ یہ زبان وہ ہے جس کے نام پر زبان والے قتل کیے گئے، جو خود زبان رکھتے تھے جن کے پاس ویسی ہی فطرت کی دی ہوئی زبان تھی، جیسی ان قاتلوں کے پاس تھی، لیکن یہ زبان کی نام نہاد وحدت، زبان کا بڑھا ہوا عشق، زبان کی عصبیت نے ان انسانوں کو جن کی زبان سے محبت کے سوا، پیار کے سوا کوئی لفظ نہیں نکلا، جنہوں نے خدا کی یاد میں پوری پوری راتیں بسر کر دیں۔ خاک و خون میں تڑپایا ہے۔ یہی زبان جب ایک ایسی مصنوعی وحدت کی بنیاد بنتی ہے جس کی اللہ کی طرف سے کوئی سند نہیں ﴿مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ﴾ تو وہ پیغمبروں کی محنتوں پر پانی پھیر دینے والی اور تمام دنیا کے اصلاحی کاموں پر خط تنسیخ پھیر دینے والی تخریبی طاقت بن جاتی ہے۔ وہ تہذیب کے ذخیروں کو آن کی آن برباد کر دیتی ہے۔ اس زبان کی وحدت نے دنیا میں وہ گل کھلائے کہ انسان بالکل تصویر حیرت بن گیا ہے۔ آپ کو اس کا خوب تجربہ ہے اور یہ خطرہ اب بھی موجود ہے کہ کوئی چالاک انسان زبان کو بنیاد بنا کر اس ملک میں تفریق و انتشار اور حمیت جاہلیہ کا زہر پیدا کر دے۔ اپنے سیاسی مقاصد کی تکمیل کیلئے اس کو کام میں لائے۔ یہ زبان آج بھی وہ تخریبی کردار ادا کر سکتی ہے جو سیزر قیصر اور چنگیز کی تلواروں نے انجام دیا۔

تہذیب کا خاصّہ

تہذیب کا خاصّہ تو یہ تھا کہ انسان کے ہر کارنامے کو اپنا سمجھا جائے، اس سے اپنے تعلق اور اپنی قدر کا اظہار کیا جائے۔ جب تہذیب خدا کی رہنمائی اور پیغمبروں کی رہنمائی سے محروم ہو جاتی ہے تو وہ تہذیب تہذیب نہیں رہتی وہ اپنے حق میں خواہ تہذیب ہو دوسروں کے حق میں تعذیب بن جاتی ہے۔

پاکستانی مسئلہ

پاکستان کے مسلمانوں کا مسئلہ یہ نہیں ہے کہ آپ تنہا اس ملک میں وحدت کے علمبردار ہیں۔ بلکہ اس وقت دنیا کے سیاسی نقشے میں اس اسلامی وحدت کے دعویدار ہیں اور اس وحدت کو(DEMORISTRATE) کرنے والے ہیں۔ اگر آپ اس وحدت سے دستبردار ہو جائیں گے یا آپ کے ملک میں لسانی جھگڑے یا تہذیبی جھگڑے، یا پرانی یا علاقائی تہذیبوں کے احیاء کا فتنہ سر اٹھائے گا۔ مثلاً یہ جذبہ پیدا ہو جائے کہ ہماری قدیم تہذیب، مسلمانوں کی آمد سے پہلے کی تہذیب کو زندہ کیا جائے تو پھر اس ملک کا خدا ہی حافظ ہے (اس معنی میں کہ اس ملک کی خیریت نہیں) اس لیے کہ اس ملک کے مختلف عناصر ترکیبی کو جو چیز مربوط کرتی ہے وہ وحدت ایمانی ہے، وحدت عقیدہ ہے، وحدت اسلامی ہے۔ اب اگر یہ نئی مصنوعی وحدتیں یہ انسانوں کے تراشے ہوئے بت جس کو اقبال کہتا ہے۔

بتان رنگ و بو کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ ایرانی رہے باقی نہ تورانی نہ افغانی

یہ بتان رنگ و بو اپنا اثر رکھتے ہیں، اور اپنے عمل میں آزاد ہیں تو اس ملک کے لیے خطرہ باقی ہے۔

یک لحظہ غافل گشتم وصد سالہ راہم دور شد

حضرات! ہم اس وقت عالم اسلام میں بڑے نازک مرحلے سے گزر رہے ہیں۔ یہ ایک عبوری مرحلہ ہے اور عبوری مرحلہ ہمیشہ بڑا نازک اور دشوار ہوتا ہے۔ اسلامی ملکوں کی قیادتیں اور اسلامی ملکوں کے دل و دماغ کوئی لمحہ ضائع کر دیں یا کسی انفرادی اور وقتی مسئلہ میں الجھ کر رہ جائیں تو زندگی کا رواں دواں قافلہ رعایت نہیں کرے گا۔ زمانہ کا سیلاب صرف سیلاب سے تھمتا ہے وہ کسی کشتی کے ڈوبنے کی پرواہ نہیں کرتا۔ حالی نے کہا تھا، اور میرا خیال ہے کہ انہوں نے اپنے محدود ماحول میں اور محدود تخیل میں کہا ہوگا۔

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

صرف حقیقت رہ جاتی ہے

جب تک ترکش کا کوئی تیر آزمایا نہ جائے اس تیر کے متعلق اس قسم کا حسن ظن قائم کیا جاسکتا ہے۔ اس سے ڈرایا بھی جاسکتا ہے، اور اس سے امید بھی قائم کی جاسکتی ہے۔ لیکن جب کوئی تیر کش سے باہر آجائے وہ استعمال ہوجائے پھر اس کے بعد صرف (تیر) حقیقت رہ جاتی ہے تجربہ رہ جاتا ہے اور کچھ نہیں رہ جاتا۔

مغرب کی نگاہیں

میں (علامہ ندوی) پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مغرب اور پوری غیر اسلامی دنیا اس وقت ان ملکوں کی طرف دیکھ رہی ہے جہاں شریعت کے نفاذ کی آواز بلند ہو رہی ہے۔ یہ تجربہ اگر ناکام ہوتا ہے تو پھر میدان صاف ہے۔ اس لیے میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ بڑا نازک مرحلہ ہے اور اس مرحلہ پر آپ کو پوری توانائیاں پوری ذہنی صلاحیتیں اپنی قوت ارادی

ایثار و قربانی کا جذبہ تعاون و اشتراک عمل اختلاف کو پس پشت ڈال دینے کی ہمت اس پر مرکوز کر دیتی ہے۔ آپ کو جماعتوں سے بالاتر ہو کر بلند تر ہو کر پاکستان کے مفاد اور اس سے بھی بالاتر ہو کر اسلام کے مفاد کو دیکھنا ہے۔ اگر آپ نے یہ شرائط پوری کر دیں تو تاریخ کا ایک نیا صفحہ پلٹے گا۔ اور ایک نئے دور کا آغاز ہو گا۔ جب ایک ایسا معاشرہ قائم ہو جائے گا تو آپ دیکھیں گے کہ دنیا بھر کے سیاح ہی نہیں بلکہ دنیا بھر کے شاہد اور مبصر آپ کے ملک میں آئیں گے تاکہ اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں اور ساری دنیا میں بیان کر سکیں اور بتائیں یہ ہم نے ایک ایسا معاشرہ دیکھا ہے جہاں گناہ ناپید ہے، جہاں ہر فرد ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی کرتا ہے جو ایک معیاری اور مثالی معاشرہ ہے۔ جہاں قلب کو سکون حاصل ہوتا ہے۔ اور روح کو اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ اور جہاں پہنچ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں آ گئے ہیں۔ اس لیے صرف اس طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ یہ ہتھیلی پر سرسوں جمانے کا کام نہیں ہے کہ ایک رات میں سب کچھ ہو جائے۔ کاش ایسا ہو جاتا، آپ اس کے لیے وہ سب تیار کریں اور وہ سب قربانیاں دیں جو ایک ایسی نعمت کے لیے دینا چاہیے جس پر انحصار ہے اسلام کی آئندہ ترقی کا اور آپ کے ملک کی قسمت کا۔

علماء اور تعلیم یافتہ طبقہ کی ذمہ داریاں

اس وقت علماء اور تعلیم یافتہ طبقہ کی ذمہ داریاں بہت بڑھ گئی ہیں۔ جب کسی دعوت یا کوشش کے ساتھ اعلیٰ طبقہ کے وہ لوگ جو ذہین اور صاحب فکر سمجھے جاتے ہیں، اور جو دین کا گہرا علم رکھتے ہیں ہوتے ہیں تو اس میں سنجیدگی گہرائی اور پختگی ہوتی ہے اور اس کے بارے میں یہ امید ہوتی ہے کہ وہ کسی غلط راستے پر نہیں پڑے گی۔ اس تحریک میں جذباتیت نہیں ہو گی، اس میں عامیانہ اور متبذل انداز نہیں ہو گا اس وقت عالم اسلام میں علماء کی اور دینی جماعتوں اور قائدین کی ذمہ داری بہت بڑھ گئی ہے یہ ذمہ داری ہر زمانہ میں زیادہ رہی ہے۔ لیکن اس زمانے

میں وہ خاص طور پر بہت عظیم بن گئی ہے کہ وہ صحیح رہنمائی کریں گے۔ اور تحریک دعوت اور جدوجہد کو سطحیت سے بچائیں گے۔ اس کے متعلق یہ تصور اور یہ تاثر قائم ہونے نہ دیں گے کہ دریا کا حباب ہے۔ بلکہ اس کے متعلق یہ تاثر دیں گے کہ اس کی جڑیں گہری اور علم دین کی زمین میں پیوست ہیں۔

فلسفہ کا ایک اہم اصول!

فلسفہ تاریخ کا یہ ایک اہم اصول ہے کہ جنگی طاقت اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک اس کے پیچھے دماغ نہ ہو۔ آئین سازی کی طاقت نہ ہو اور کوئی منظم ادارہ نہ ہو۔

سب سے خطرناک بات

سب سے خطرناک بات آپس کی نزاع ہے۔ ہماری آپس کے دینی مباحث کا میدان اور ہے اس کے کہنے کا موقع اور ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے مکتوبات میں لکھا ہے کہ اکبر اس لیے دین سے متنفر ہوا کہ اس نے علماء کو مرغوں کی طرح لڑتے دیکھا۔ اگر کوئی مسئلہ چھڑتا تو ان میں آپس میں اتنی تیز بحث ہوتی اور ہر ایک دوسرے پر اپنا تفوق اس طرح ظاہر کرنے کی کوشش کرتا جیسا کہ پکے دنیا والے اور جاہ طلب کرتے ہیں۔ اکبر نے سوچا کہ یہ کیسے لوگ ہیں، یہ ہمارے وزراء، ارکان سلطنت اور خالص دنیا والے لوگ بھی اس سطح پر نہیں آتے۔ جب حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کو یہ معلوم ہوا کہ جہانگیر کا ارادہ ہے کہ وہ چند علماء کو اپنے دربار میں مشورہ کرنے کے لیے رکھے تو انہوں نے نواب سید فرید کو خط لکھا کہ خبردار خبردار! بادشاہ کو رائے دو کہ مخلص اور حقانی عالم صرف ایک آدمی کو رکھے۔ یہ مجدد صاحب کی فراست ایمانی تھی جو انہوں نے اس بات کو سمجھا۔ میں نہیں کہتا کہ ہر موقع اور مجلس میں صرف ایک ہی عالم رہے، لیکن میں کہتا ہوں کہ علماء کے آپس کے نزاعات اور بحث اور نفی کرنے سے اور ایک دوسرے کی تذلیل کرنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے۔

معاشرہ کا عیب

معاشرہ کا عیب یہ نہیں کہ وہ فاسد الاخلاق ہو گیا ہے۔ خطرہ کی بات یہ ہے کہ معاشرہ فاسد المزاج ہو گیا ہے اور کسی معاشرہ کا فاسد الاخلاق ہونا اتنا خطرناک نہیں اس کے لیے سو تدبیریں ہیں لیکن معاشرہ جب فاسد المزاج ہو جائے تو پھر دوا بھی اثر نہیں کرتی۔

اسلام کا جھنڈا بلند کرنے کے لئے

ہر ایسے ملک کو جس کو اسلام کی خدمت کرنی ہے اور جس کو اسلام کا جھنڈا بلند کرنا ہے، اپنے ملک کو اس ذہنی کشمکش سے بچانا چاہیے اس لیے کہ اس ذہنی کشمکش کے شروع ہو جانے کے بعد پھر وہ ساری ذہانتیں اور قوت عمل وہ سب کی سب اس میں لگ جاتی ہے۔ ملک کی تعمیر میں ملک کو مستحکم کرنے میں، سالمیت کی حفاظت میں جو توانائیاں صرف ہونی چاہئیں، اس میں صرف ہوتی ہیں، کون جیتے کون ہارے کس کا فلسفہ اخلاق، کس کا فلسفہ مابعد الطبعیات کس کا فلسفہ حیات غالب اور کار فرما رہے۔

ملک کی عظمت کا حقیقی معیار

کسی ملک کی ترقی اور اس کی بڑائی صرف یہ نہیں ہے کہ اس میں یونیورسٹیوں کی تعداد ہے۔ اس کی زمین میں زراعتی صلاحیت کتنی ہے۔ اس کے محاصل کتنے ہیں۔ اس میں کتنے سرمایہ دار پائے جاتے ہیں۔ اس کا معیار زندگی کتنا بلند ہے۔ بلکہ ملک کی عظمت کا حقیقی معیار یہ ہے کہ اس کے اہل علم میں بحث و تحقیق کرنے کا کتنا ذوق پایا جاتا ہے۔ اور خالص فنی اور تحقیقی دانش گاہیں اور جامعات کتنی ہیں؟ اگر کوئی ملک سب کچھ رکھتا ہے اس کے اندر قدرتی دولتوں کے بڑے بڑے ذخائر ہیں، فطرتی اور قدرتی وسائل بھی ہیں، لیکن اس میں ذوق تجسس نہیں ہے۔ تحقیق کا خالص علمی اور سنجیدہ ذوق نہیں پایا جاتا۔ ایسے لوگ کافی تعداد میں نہیں ہیں۔ جو اپنی زندگیاں

وقف کر چکے ہوں۔ تعریف وتحسین سے بے نیاز ہو کر تحقیقی کام کرنے کے لیے اللہ تبارک وتعالیٰ کی رضا کے لیے (جو اصل مقصود ہے) اور اس ملک کی ترقی و بہبودی کے لیے وہ دن رات کام میں لگے رہتے ہیں ان کو حکومت یا کسی ادارے سے انعام کا کوئی لالچ نہیں ہے وہ تھکتے ہوں اور تھکنے ہی سے ان کو راحت ملتی ہو۔ تعطل اور بیکاری اور آرام ان کے لیے سزا ہو ان کے لیے اس سے بڑھ کر سزا نہ ہو کہ ان کو تحقیقی کام کرنے سے روک دیا جائے۔ کام ہی ان کی غذا ہو، دوا ہو، ان کا انعام ہو۔

اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

یہ شکوہ کرنا کہ ہمیں بہت نازک زمانہ ملا ہے اور ہماری راہ کانٹوں سے بھری ہوئی ہے۔ کم ہمتی کی بات ہے، بلند ہمتی کی بات یہ ہے کہ اگر راستہ آسان ہو تو آدمی کو شبہ ہونے لگے اپنے بارے میں کہ مجھے اس قابل نہیں سمجھا گیا کہ میں کسی مشکل پر چلوں۔ اگر زندگی ساری کی ساری سہولتوں سے لبریز ہوتی تو زندگی میں لطف نہ رہتا، شاعر نے خوب کہا ہے۔

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موج حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

اپنی فکر کیجئے

دوسری بات یہ ہے کہ اپنی فکر کیجئے۔ اس زمانہ کا ایک عیب یہ بھی ہے کہ دوسروں کی فکر زیادہ اپنی فکر کم ہوتی ہے۔ ہمارے اجتماعی فلسفہ اور سیاسیات نے یہ ذہن پیدا کیا ہے کہ آدمی کی نظر دوسروں کے عیوب پر پڑتی ہے اس کا محاسبہ زیادہ تر دوسروں سے ہوتا ہے۔ فلاں پارٹی یہ کر رہی ہے، فلاں طبقہ یہ کر رہا ہے فلاں شخص اپنی ذمہ داری پوری نہیں کر رہا ہے۔ اور اس کی فرصت ہی نہیں ملتی کہ آدمی اپنا جائزہ لے اور دیکھے کہ ہم میں کیا نقص ہے۔

اپنا مطالعہ وسیع کیجئے

مطالعہ آپ وسیع بھی کیجئے اور عمیق بھی، آپ کے مطالعہ میں وسعت بھی ہونی چاہیے اور عمیق بھی ہونا چاہیے، یعنی آپ اسلام کے اصل سرچشمہ سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کیجئے۔ آپ کو عربی زبان سے واقفیت کے بغیر ہم وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ یہ بات کس درجہ کی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہر قسم کا لٹریچر پڑھیں، جس میں کوئی گمراہی کی بات نہ ہو کوئی کجی نہ ہو، کسی ایک لٹریچر پر انحصار کرنا صحیح نہیں ہے۔ ایک ماڈل جو مکمل ہے وہ صرف رسول اللہ ﷺ کا ماڈل ہے۔ کسی انسان کا ماڈل ایسا نہیں ہے جو سب سے مستغنی ہو، کسی کے متعلق یہ خیال نہیں ہونا چاہیے کہ یہ آخری ماڈل ہے اس کے بعد کسی کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ کسی لٹریچر پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ تنگ نظری سے کم سے کم آپ کو کام نہیں لینا چاہیے۔

میرا ہمیشہ یہ ذوق رہا ہے اور کہتا بھی رہتا ہوں کہ کتابوں کا تنوع ہونا چاہیے اور جو چیزیں اچھی ہوان کو دیکھنا چاہیے۔ البتہ اپنے ذہن میں یہ صلاحیت پیدا ہو کہ درجہ کو پہچان سکیں اور اس کے اثرات ونتائج محسوس کر سکیں۔

نافعیت کا احترام واعتراف

ان میں سے ایک سنت اللہ لوگوں کا نافعیت وافادیت کے سامنے جھکنا، اس کی قدر کرنا اور اس کو تسلیم کرنا ہے۔ نافعیت اور اس کے محل ومرکز کے ساتھ محبت کا ہونا ''نافع'' کو تلاش کرنا اس کی طرف رجوع کرنا اور وہ مل جائے تو اس کی قدر کرنا انسانی فطرت میں داخل ہے۔ نافعیت کی بقاء اور اس کی زندگی اور سرسبزی کی اللہ تعالیٰ نے ضمانت کی ہے اور جو اس سے خالی ہے۔ اس کے لیے یہ ضمانت نہیں سورہ رعد میں صاف فرمایا گیا

كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَ الْبَاطِلَ ۬ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَ اَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ؕ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ

الْاَمْثَالَ ﴿۱۷﴾

(ترجمہ) سوجھاگ توسوکھ کر زائل ہو جاتا ہے اور (پانی) جو لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ وہ زمین میں ٹھہرا رہتا ہے اسی طرح خدا (صحیح اور غلط کی) مثالیں بیان فرماتا ہے (تاکہ تم سمجھو)۔

"بقائے اصلح" نہیں بلکہ قرآنی زبان و اصطلاح میں "بقائے انفع" کا یہ قانون ہزاروں لاکھوں برس سے چل رہا ہے۔ اور ہزار تبدیلیوں کے باوجود چلتا رہے گا۔ نافعیت کے لیے پنپنا، پھلنا پھولنا اور اپنی قیمت اور اہمیت تسلیم کرالینا مقدر ہو چکا ہے۔ نافع بن جانا ہزار مخالفتوں اور فتنوں سے حفاظت کا ذریعہ ہے اس کے لیے پروپیگنڈہ اور پبلسٹی کی ضرورت نہیں، نافع کے اندر محبوبیت کی صفت ہے اس میں رنگ و مذہب اور قوم و وطن کی بھی تفریق نہیں "نافع" اگر پہاڑ کی چوٹی پر بھی جاکر بیٹھ جائے گا تو دنیا اس کو تلاش کرنے کے لیے وہاں پہنچے گی۔ اور اس کو ہاتھوں ہاتھ سر پر بٹھاکر بلکہ آنکھوں میں جگہ دے کر لائے گی۔ یہ اللہ کی سنت ہے جو ہزاروں لاکھوں برس سے چلی آرہی ہے۔

نافع کی تلاش و طلب

عزیز طلبہ! آپ اپنے اندر نافعیت پیدا کرنے کی کوشش کیجئے۔ آپ سے زندگی کی شب تاریک میں راہ رؤں کو روشنی اور رہنمائی ملتی ہو، آپ کی مدد سے علمی عقدے حل ہوتے ہوں، آپ کی محبت میں بیٹھ کر ایمان میں طاقت پیدا ہوتی ہو، آپ کے پاس جاکر آدمی کچھ لے کر آتا ہو اس کے بعد اگر آپ اپنے اور لوگوں کے درمیان دیواریں کھڑی کر دیجئے اپنے مکان کا دروازہ بند کر کے بیٹھ جایئے لوگوں کو اگر یہ معلوم ہو گا کہ یہاں ایک نافع رہتا ہے، اس سے فلاں قسم کا فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے (روح کا فائدہ اور ایمان کا فائدہ تو بہت بڑی چیز ہے) تو لوگ دیواریں پھاند کر اور دروازہ توڑ کر آپ کے پاس پہنچ جائیں گے۔

استغناء و بے غرضی کی طاقت و تاثیر

اللہ تعالیٰ کی یہ بھی سنت ہے کہ جو مانگے لوگ اس سے گھبرائیں، اور جو دامن پھیلائے اس سے بھاگیں اور جو اپنی مٹھی بند کرلے اور دامن سمیٹ لے اس کے قدموں میں پڑیں اور خوشامد کریں کہ وہ کچھ قبول کرلے۔ استغنا میں ازل سے محبوبیت و مقبولیت ہے۔ اور طلب میں ذلت گویا مستغنی سے احتیاج کا معاملہ ہے۔ اور طالب سے استغناء کا یہ بھی ایک سنت خداوندی ہے جس میں زمانہ کی تبدیلی کے باوجود کوئی تبدیلی نہیں۔ چوتھی صدی کے حالات آپ پڑھیں تو یہی نظر آئے گا آٹھویں صدی کے پڑھیں گے تو اسی طرح کے واقعات ملیں گے، اور چودھویں صدی میں بھی یہی ہورہا ہے۔

کسب کمال کن کہ عزیز جہان شوی

آخری خصوصیت کمال امتیاز اور کسی چیز میں مہارت تامہ ہے۔ علوم عالیہ تو بڑی چیز ہے علوم آلیہ میں بھی اگر کسی فن میں کمال پیدا ہوجائے اور اس سے بھی نیچے اتر کر اگر کسی کو خطاطی وراقی میں کمال حاصل ہو تو اچھے اچھے اہل علم اس کے پیچھے پیچھے پھرتے ہیں۔ بڑے بڑے مصنفین بڑے بڑے ناشر کاتبوں کی ناز برداری کرتے ہیں، ان کے نخرے سہتے ہیں ان کی خوشامد کرتے ہیں کہ وہ وقت پر لکھ کردیں، کم سے کم کتاب کا نام ہی لکھ دیں جس کا بلاک بنایا جاسکے۔

آپ اگر کسی صاحب کمال کو یا علم کے کسی ماہر خصوصی کو دیکھتے ہیں یا اس کے متعلق سنتے ہیں کہ وہ عسرت و بیکاری کی زندگی گزار رہے ہیں تو آپ یہ سمجھ لیجئے کہ اس صاحب کمال کے ساتھ کوئی ایسی کمزوری یا مزاجی خرابی لگی ہوئی ہے جس نے اس کے سارے کمالات پر پردہ ڈال دیا ہے۔ مثلاً غصہ بہت ہے مزاج میں تلون ہے، کاہلی ہے محنت نہیں ہوتی، پڑھانے میں جی نہیں لگتا بے ضابطگی کی عادت پڑگئی ہے۔ کسی کی کوئی بات برداشت نہیں ہوتی اس سے آگے بڑھ کر کچھ راق ہے سنک ہے۔ کسی جگہ ٹھہرنے نہیں پاتے، فوراً آن بن ہوجاتی ہے۔ ایسی کوئی نہ کوئی بات

آپ ضرور پائیں گے جس کی وجہ سے ان کے کمال اور علم سے فائدہ نہیں اٹھایا جاسکا اور گوشہ گمنامی یا کسمپرسی میں دن گزار رہے ہیں۔

درختِ پر ثمر

وہ زندگی زندگی کہلانے کی مستحق نہیں جس میں نمو کی صلاحیت مفقود ہو چکی ہو۔ درخت شاداب اور پر ثمر نہیں کہلایا جاسکتا جو اپنی نمو کی صلاحیت کھودے۔

مذہب کی تاریخ کی بعض آزمائشیں

مذہب کی تاریخ میں ہمیں بعض وقفے نظر آتے ہیں۔ جہاں ہم دیکھتے ہیں کہ مذہب اور زندگی کا ساتھ چھوٹ گیا ہے وہاں مذہب سے زیادہ پیراوان مذہب اس کے ذمہ دار ہوتے ہیں جو مذہب کے اعلیٰ اصول، عملی زندگی میں جاری اور ساری کرنے میں کوتاہی برتتے ہیں یہ مذہب کی کوتاہی نہیں کہ وہ زندگی کا ساتھ نہیں دیتا۔ یہ پیروان مذہب کی کوتاہی ہے کہ وہ اپنی سستی اور کوتاہی سے زندگی کے قافلے سے بچھڑ جاتے ہیں لیکن مذہب اور پیروان مذہب کا ایسا مستحکم رشتہ اور نازک تعلق ہے کہ ان دونوں کے درمیان بہت کم نگاہیں فرق کر سکتی ہیں کہ یہ کوتاہی مذہب کی ہے یا پیروان مذہب کی۔ تاہم ایک عظیم ادارے اور ایک عظیم تحریک کے علمبردار حقیقت پسندانہ، ناقدانہ اور مذہبی علمی اور گروہی عصبیتوں سے علیحدہ ہو کر تاریخ کا بے لاگ اور غیر جانبدارانہ جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ اسلام بحیثیت دینی اور آسمانی تعلیمات کے اس کا ذمہ دار نہیں تھا۔ اور اس کے اندر کوئی ایسا نقص موجود نہیں تھا جو اس کو زندگی کا ساتھ دینے اور اس کے مسائل حل کرنے سے باز رکھے۔

ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب

انسانوں کی پرانی کمزوری ہے کہ وہ اپنی ذمہ داری دوسروں پر ڈال دیتے ہیں۔ جب بہت

سے مسلمانوں سے قرآن مجید کی روشنی میں مسائل حاضرہ کے حل کرنے اور اپنی محنت و ذہانت سے قرآن مجید کے رہنما ابدی اصولوں اور بدلتی ہوئی زندگی کے درمیان مطابقت پیدا کرنے میں کوتاہی ہوتی ہے تو وہ اپنے قصور اقرار کرنے کے بجائے قرآن مجید پر زندگی کے ساتھ نہ دے سکنے کا الزام لگاتے ہیں۔ یا مخالفین کو یہ تاثر دیتے ہیں کہ قرآن مجید معاذ اللہ ناقص ہے۔ اس لیے کہ وہ ان کی ہر خواہش اور ہر ضرورت کے لیے سند جواز مہیا نہیں کرتا۔ اقبال نے اسی حقیقت کو اپنے اس شعر میں بیان کیا ہے۔

ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب
کہ سکھاتی نہیں مؤمن کو غلامی کے طریق

بعض لوگ اس سے ایک قدم آگے بڑھا کر خود قرآن مجید کو اپنی خواہشات اور اپنی کمزوریوں اور بے اصولیوں کا تابع بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ اس کی ایسی تفسیر کرنے لگتے ہیں جس سے ان کی غلط زندگیوں کا جواز نکلے۔ وہ اپنے کو قرآن مجید کے سانچے میں ڈھالنے کے بجائے قرآن مجید کو اپنے فکر و عمل کے سانچہ میں ڈھالنے کی کوشش شروع کر دیتے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے مقدمہ تفسیر میں اپنے مخصوص ادیبانہ اور بلیغ انداز میں اس صداقت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"انہوں نے جب دیکھا کہ قرآن مجید کی بلندیوں کا ساتھ نہیں دے سکتے تو انہوں نے اس کو اس کی بلندیوں سے نیچے اتارنے کی کوشش کی تا کہ وہ ان کی پستیوں کا ساتھ دے سکے۔"

باصلاحیت افراد کی کمی

وہ سارے وقفے جو ہمیں مذہبی حلقے پر جمود طاری نظر آتا ہے یا پیروانِ مذہب کی زندگی میں الجھنیں پیدا ہو گئی ہیں۔ یہ ان باکمال شخصیتوں کے فقدان یا کمی کا دور ہے جو زمانے کے چیلنج کو

قبول کر کے مذہب کی مؤثر نمائندگی کرتے ہیں۔ اسلامی تاریخ کے جس دور میں بھی مذہب کی بہتر نمائندگی ہوئی۔ اسلام اور شریعت اسلامی پر معاشرے میں کبھی بھی بے اعتمادی پیدا نہیں ہوئی، اسلامی تاریخ کے مختلف ادوار میں ہمیں زمانے کی سطح سے بلند ایسی شخصیتیں نظر آتی ہے۔ جنہوں نے اپنی اعلیٰ صلاحیت اور عبقری (GENIUS) شخصیت سے اپنے دور کے فتنوں کا سدباب، اپنے زمانے کے پیدا شدہ نئے مسائل کے حل اور مذہب کی طاقتور نمائندگی کا فریضہ نہایت کامیابی سے انجام دیا۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اس دور میں پیدا ہوئے جب ان کی ضرورت دین اور زمانے کو تھی۔ انہوں نے اسلامی شریعت و قانون کو منقسم شکل میں پیش کر کے اسلامی سلطنت کی وسعت اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل کو حل کیا۔ بعد کے دور میں امام ابوالحسن اشعری اور امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ جیسے عالی دماغ افراد آئے اور انہوں نے ان خطرات اور فتنوں کا مقابلہ کیا جو ان کے زمانے میں پیدا ہوئے تھے۔

دماغی صلاحیتوں کا خزانہ

دماغی صلاحیتوں کا خزانہ کسی ایک طبقہ میں مرکوز نہیں ہے۔ نہ کبھی مرکوز رہا ہے اور نہ کبھی مرکوز ہو سکتا ہے۔ اور ایسا ہونا کچھ اچھا بھی نہیں۔ اس طبقہ کے لیے خواہ یہ بات کتنی ہی نازش و افتخار کی ہو۔ لیکنن انسانیت کے حق میں یہ کوئی بہتر بات نہیں ہے کہ انسانی ذہانتوں کا خزانہ اور محنتوں کا ذخیرہ کسی ایک طبقہ میں مرکوز ہو کر رہ جائے۔

دلچسپی اور شغف عارضی نہ ہو

دلچسپی اور شغف عارضی نہ ہو مثلاً کسی سیمینار کے لیے ہم کسی موضوع کو اپنے اوپر تھوڑی دیر کے لیے طاری کرلیں پھر اس کے بعد جیسے جگالی کی جاتی ہے پڑھ کر ہم اس کو اگل دیں اور نہ ہمیں اس موضوع سے محبت ہو اور نہ وفاداری ہو نہ فکر ہو کہ اس سلسلے میں کیا ہوا۔ نہ اس میں

اضافہ کرنے کا شوق ہو۔ اس موقع پر اقبال سے مدد لیتا ہوں۔ انہوں نے اس حقیقت کو خوب بیان کیا ہے کہ۔

مقصود ہنر سوز حیات ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا

علم اور تحقیق بھی ایک ہنر ہے اور اس ہنر کو زندگی بھر کا ساتھ دینا چاہیے۔ اس میں مقصدیت پیدا ہونی چاہیے۔ وہ مثلِ شرر نہیں کہ بھڑکا اور بجھ گیا۔

عربی زبان کی اہمیت

عربی زبان کی اہمیت بنیادی چیز ہے۔ اگر آپ کو علوم اسلامیہ پر کوئی کام کرنا ہے تو یہ بڑے نقص لفکش (DISQUALIFICATION) کی بات ہو گی۔ آپ عربی سے ناآشنا ہوں۔ قرآن، حدیث اور اسلامیات پر لکھنے والے بہت سے مشرقی اور مغربی فضلاء سے عربی نہ جاننے کی وجہ سے نادانستہ ایسی غلطی ... ہو جاتی ہے جو بعض اوقات ان کے پورے علمی کارنامے پر پانی پھیر دیتی ہے۔

تین اہم بنیادی باتیں

(۱) اخلاص (۲) جذبہ قربانی (۳) جوہر ذاتی

اخلاص

پہلی چیز اخلاص ہے۔ آپ کسی بڑے سے بڑے بزرگ یا جس کا نام آپ دنیا میں روشن پاتے ہیں، اگر آپ اس کی زندگی کا مطالعہ کریں گے تو اس کی زندگی کی تعمیر میں اخلاص کو ایک اہم عامل پائیں گے۔ آپ دیکھیں گے اس کی ہر چیز کو اخلاص نے دوام بخشا ہے۔

جذبہ قربانی

دوسری بات جو ہمیں آپ سے کہنی ہے وہ ایثار و قربانی ہے۔ ایثار و قربانی اور عزم یہ وہ طاقت ہے کہ اگر افراد میں ہوتی ہے تو انہیں ثریا تک پہنچادیتی ہے۔ اور اگر کسی ادارہ یا قوم کے اندر پیدا ہو جاتی ہیں تو دنیا اس کے سامنے جھک جاتی ہے اور اس کی بالادستی کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔

جوہر ذاتی

اس کے بعد جو تیسری بات ہے وہ جوہر ذاتی ہے۔ انسان کا ذاتی جوہر اور اس کی قابلیت ہی وہ چیز ہے جو ہر وقت اور ہر زمانے میں اس کی ترقی کا واحد ذریعہ ہے۔ اگر آپ نے ان تینوں چیزوں یعنی اخلاص جذبہ قربانی اور جوہر ذاتی کو حاصل کر لیا ہے تو آپ کے لیے زمانہ بالکل نہیں بدلا ہے اور ہر وقت آپ کے لیے چشم براہ ہے۔ لیکن ان صفات سے اگر کوئی خالی ہے تو وہ جہاں بھی جائے گا اور جس جگہ کی بھی سند یا ڈگری اس کے پاس ہوگی حالات کو بدلا ہوا اور اپنے مخالف پائے گا۔ پھر میں کہتا ہوں کہ اگر آپ نے یہ صفات اپنے اندر پیدا کر لیں تو آپ کے لیے عالمگیر کا زمانہ نظام الملک طوسی کا زمانہ اور امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ، امام رازی رحمۃ اللہ علیہ، امام ابن قیم اور اما ابن تیمیہ کا زمانہ آج بھی منتظر ہے۔ اور وہ آپ کے لیے واپس ہو سکتا ہے۔ یہ غلط ہے کہ زمانہ میں کوئی جگہ خالی رہتی ہے۔ کبھی زمانہ میں ایسا نہیں ہوا کہ کوئی جگہ پہلے سے خالی ہو اور کسی کے لیے منتظر ہو کہ جب وہ شخص فارغ ہولے گا تو اس کو وہ جگہ مل جائے گی۔ زمانہ ”بقائے اصلح“ کا قائل ہے وہ بہت ہی حساس اور نقاد ہے۔ وہ صالح کے بجائے اصلح نافع کے بجائے انفع کو ترجیح دیتا ہے۔ لہٰذا اگر آپ کے اندر یہ چیزیں ہیں تو ہر وقت زمانہ آپ کا ہے اور آپ کے لیے منتظر ہے۔ زمانہ کا شکوہ دراصل اپنی کمزوری کو چھپانے کی کوشش اور احساس کمتری کی علامت ہے دنیا نہیں بدلی ہے ہم بدل گئے ہیں زمانہ آج بھی وہی ہے جو پہلے تھا تبدیلی صرف ہمارے اندر پیدا ہوئی ہے۔

خدا کی قسم یہ خطرہ ہرگز نہیں

مجھے خدا کی قسم تمہارے متعلق یہ خطرہ ہرگز نہیں کہ تم یہاں سے (مدرسہ) جانے کے بعد فقر سے دوچار ہو گے۔ خطرہ جو ہے وہ صرف اس بات سے کہ کہیں اس نعمت عظمیٰ (علم) کی ناقدری سے جو اللہ تعالیٰ نے تم کو عطا فرمارہا ہے تم پر ادبار نہ آجائے اور اگر تم نے شکر ادا کیا تو اس نعمت کے شکر کے عوض تمہاری استعداد کہیں زیادہ بڑھ جائے گی ﴿لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ﴾۔

تمہارا میدان

آج عالم اسلام کی نگاہیں ان درسگاہوں (دینی درسگاہ) کی طرف لگی ہوئی ہے۔ جو ان باتوں کو سمجھنے کی اہلیت و صلاحیت رکھتی ہیں۔ جن کے بانیوں نے اپنے نصاب و نظام میں اس کی صلاحیت پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ کہ جب عصر حاضر کا کوئی نیا فتنہ پیدا ہو تو ہمارے فضلاء اس کو سمجھ سکیں اور اس کا مقابلہ کر سکیں۔

تم کیا بن سکتے ہو؟

تم ایسے بن سکتے ہو کہ تمہارا شہر نہیں پورا ملک بلکہ پوری امت اور ملت کی تقدیر بدل سکتی ہے۔ تم وہ پارس بن سکتے ہو کہ اگر تم سے کوئی خدا کا باغی اور سرکش چھو جائے تو ولی کامل بنائے جس بستی تم جاؤ وہاں بہار آجائے۔ وہاں کا موسم اور فضا بدل جائے۔ یہ تاثیر آج بھی تمہارے اندر پیدا ہو سکتی ہے۔ تمہاری وجہ سے نہ جانے کتنی قومیں جنتی ہو سکتی ہیں، بیشک نبوت تو ختم ہو چکی لیکن تم آیہ من آیات اللہ بن سکتے ہو حجۃ الاسلام شیخ الاسلام ہو سکتے ہو۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ تم نائبان رسول ہو سکتے ہو یہ سب چیزیں تم کر سکتے ہو لیکن اس کے لیے شرط یہ ہے تم عزم کرو کیونکہ تم خدا کا قرب حاصل کرنے آئے (مدرسہ) ہو صاحب کمال اور صاحب امتیاز بننے کے لیے

آئے ہو اگر تم کامیابی اور ترقی کا فیصلہ کرلو تو اس کائنات کا ذرہ ذرہ تمہاری مدد کرے گا، پورا نظام کائنات تمہارے لیے وقف ہو جائے گا۔

مدرسہ کیا ہے

وہ جگہ ہے جہاں طالب علم کے درمیان جیسا کہ میں نے پہلے کہا اور خدا کے درمیان ایک بلا واسطہ کی کڑی ہے جس کا سرا ادھر ہے اور دوسرا اللہ کے قبضہ میں ہے۔

قدیم رسم

مشرقی تہذیب میں بہت قدیم زمانے سے یہ رسم چلی آرہی ہے کہ جب کوئی شخص کسی دور دراز سفر پر روانہ ہوتا ہے یا ایک دوسرے سے جدا ہوتا ہے تو اس وقت اپنے کسی بڑے مخلص یا تجربہ کار سے کچھ نصیحتیں اور کچھ وصیتیں سننا چاہتا ہے جو اس نے اپنے زندگی کے تجربات سے حاصل کی ہے۔

چند باتیں

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ آپ اپنے زندگی کے لیے ایک شخصیت کا انتخاب کرلیں یہ حقیقت ہے کہ چراغ چراغ سے جلتا ہے اور دیا دیا سے اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ کوئی بھی مخلص بندہ آپ کو کہیں مل جائے تو اس کو آپ اپنا رھنما مان کر اپنی زندگی کی نئی تعمیر کریں اس میں آپ کو پورا پورا اختیار ہے کہ جس کو چاہیں اور جہاں چاہیں ایشیا یا ایشیا سے باہر دنیا کے کسی گوشہ میں آپ اس کو دریافت کرلیں بلکہ میں آگے بڑھ کر یہاں تک کہتا ہوں کہ زندوں میں آپ کو کوئی ایسا نظر نہ آئے تو ماضی کی شخصیتوں میں اس کو تلاش کیجئے اور جہاں کہیں یہ بندہ خدا آپ کو ملے اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیجئے اور کچھ دنوں تک اس کی ہر چیز کو اپنے اندر منتقل کرنے کے کوشش کیجئے انسان میں یہ صفت بہت نمایاں ہے کہ وہ جس چیز کو چاہتا ہے اس

کو نقل کرلیتا ہے آپ اس کی ہر چیز کی نقل اتاریئے اس کے بعد آپ بڑے ہو سکتے ہیں اس سے آگے بھی نکل سکتے ہیں اور ایسی جگہ بھی پہنچ سکتے ہیں جہاں آپ کو اس تعلق کی ضرورت نہ ہوگی اگرچہ یہ بات بہت کم لوگوں کو حاصل ہوتی ہے۔

ذاتی محنت

دوسری بات جو آپ سے کہنی ہے وہ یہ ہے کہ آپ تاریخ کی شخصیتوں میں سے جس کا بھی نام لیں جب آپ اس کی سیرت کا مطالعہ کریں گے اس کی زندگی کی تہ تک جانے کی کوشش کریں گے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ اس کی شخصیت کو بنانے اور سنوارنے والی سب سے اہم اور بنیادی چیز اس کی ذاتی محنت اور اس کی فکر و لگن مقصد کی دھن اور اس کی تڑپ تھی اس کے بغیر اساتذہ چاہیں یا عظیم الشان ادارے اس کے لیے کوشش کریں کسی کے بس میں کچھ نہیں ہے جو بنا ہے وہ اپنی ذاتی محنت اور جد وجہد سے بنا ہے یقیناً اللہ تعالی کی توفیق اور اساتذہ کی رہنمائی بھی ضروری ہے لیکن اگر اللہ کی توفیق شامل حال ہے تو پھر اپنی ذاتی محنت سے انسان اپنے آپ کو سب کچھ بنا سکتا ہے۔

جذبۂ خدا طلبی

تیسری بات جو آپ سے کہنی ہے وہ یہ ہے کہ ہر وقت اس چیز کی فکر کرنی چاہیے جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے اور جو چیز حقیقت میں اس کو کام آنے والی ہے وہ آخرت کی فکر خدا کی مرضی اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کا شوق اور جذبہ ہے اگر انسان کے اندر یہ چیز نہیں ہے تو خواہ وہ بڑے سے بڑا ادیب ہو بہت بڑا مقرر اور خطیب ہو یا بہت بڑا مفسر و فقیہ ہو اس دولت سے محروم ہی رہے گا یہ ممکن ہے تھوڑی دیر کے لیے کچھ واہ واہ اور کچھ ناموری اور کچھ داد و تحسین حاصل کرلے مگر آگے اس کا کچھ حصہ نہیں حقیقت میں جو چیز کام آنے والی ہے وہ خشیت الٰہی ہے وہ آخرت کی فکر ہے وہ اللہ کی مرضی کی تلاش ہے۔

بچپن کا خیال

انسان جو کچھ بچپن میں سوچتا ہے بعینہ ان چیزوں کو اللہ تعالی کسی نہ کسی موقع پر پورا کر دیتا ہے لہذا جو خیال کرو جو آرزو تمنا کرو بہت سوچ سمجھ کر کرو ایسا نہ ہو کہ بعد میں تمہیں افسوس کرنا پڑے یہ بڑے تجربے کی بات ہے بچپن کا خیال حقیقت بن کر سامنے آتا ہے ابھی سے تم ارادہ کرو کہ اسلام کا نام روشن کروگے اللہ کا پیغام پہنچاوگے اسلام کے سچے اور مخلص داعی بنوگے ایسا نہ سوچو جیسے کہ بعض بچے سوچتے ہیں کہ ہم ٹی ٹی آئی (TTI) بنیں گے اور مفت سفر کریں گے یا ہم تھانیدار یا اسی طرح چاہیے اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم ٹی ٹی آئی کے بجائے گارڈ بننے کی سوچنے لگو یا تھانیدار کے بجائے ایس پی بلکہ اللہ تعالی کو بچپن کی کچھ معصومیت اتنی پسند ہے کہ اس وقت بچہ جو سوچتا ہے اللہ تعالی اس کو پوری کرتا ہے تم اونچے سے اونچا ارادہ کرو اور اچھی سے اچھی آرزو کرو اور تم یہ آرزو کرو کہ اللہ نے جو پیغمبروں سے کام لیا وہ ہم کریں گے اللہ کے ولی اور دوست بنیں گے ہم بہت بڑے عالم اور فاضل بنیں گے اور اللہ کے بندوں کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچائیں گے دیکھو اللہ نے انسان کے اندر یہ صلاحیت رکھی ہے کہ وہ سب کچھ بن سکتا ہے فرشتہ بلکہ فرشتہ سے بڑھ سکتا ہے اس لیے کہ انسان میں بہت سی وہ صلاحیتیں ہیں جو فرشتوں میں نہیں ہے جب معاملہ یہ ہے کہ آدمی بہت کچھ بن سکتا ہے اور بہت بڑا بن سکتا ہے تو تم چھوٹی اور گری پری آرزوئیں کیوں کرو تم ہمیشہ یہ آرزو کرو کہ اللہ ہمیں اپنے دین کی خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور تم سے وہ کام لے جس کی زمانہ کو ضرورت ہے ہماری آرزو تم سے یہی ہے اور ہماری تمنا اور خواہش بھی یہی ہے۔ آمین

محنت و کاوش

کوئی مدرسہ اور کوئی کتب خانہ کسی انسان کو نہیں بناتا انسان خود اپنی قوت بازو سے اپنی محنت اور کاوش سے بنتا ہے اگر آپ بزرگی کے شعبہ میں دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ وہی

برگزیدہ بندے تھے جن کے سرپرست ولی نہیں تھے ان کے لیے ماحول ناسازگار تھا لیکن وہ اپنی محنت سے اپنی تڑپ و پیاس سے ولی کامل بن گئے ہزاروں مثالیں ہیں کہ آذر کے گھر سے ابراہیم پیدا ہوئے حجۃ الاسلام امام غزالی کے والد کے متعلق کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ولی تھے لیکن امام غزالی اپنی طلب اور تڑپ کے بل بوتے پر حجۃ الاسلام بن گئے اور ان مقامات تک پہنچے جن کے سامنے بڑے بڑے اولیاء اللہ کے اولاد سرنگوں ہو جاتی ہیں۔

زمانہ بڑا بے رحم

یہ علمی معیار بھی ہمارے لیے یقینا قابل احترام ہے اس کے ساتھ بہت عزیز یادیں اور یادگاریں وابستہ ہیں یہ ہماری تاریخ کا ایک جزء ہے لیکن زمانہ بڑا بے رحم ہے اور بے مروت واقع ہوا ہے وہ بڑی سے بڑی مقدس جماعت کے ساتھ بھی مروت نہیں کرتا وہ کسی کے سامنے آسانی کے ساتھ سر تسلیم خم نہیں کرتا زمانہ کی فطرت ہے کہ جب تک اس کو اعتراف پر مجبور نہ کر دیا جائے وہ کسی کا اعتراف نہیں کرتا کسی چیز کا تسلسل زمانہ کے لیے بالکل کافی نہیں ہے زمانہ ایسا حقیقت پسند ایسا بے مروت اتنا غیر جانبدار ہے کہ جب تک اس کے ہاتھ میں کوئی نئی چیز نہ دی جائے اور اس کی گردن کو کسی بوجھ سے ایسا بوجھل نہ کر دیا جائے کہ وہ جھکنے پر مجبور ہو جائے اس وقت تک وہ جھکنے کے لیے تیار نہیں ہوتا زمانہ سے کسی قسم کا اقرار کرا لینا کسی قسم کی سند حاصل کر لینا کوئی تمغۂ امتیاز یا خراج عقیدت حاصل کرنا۔۔۔۔بچوں کا کھیل نہیں ہے اور محض روایت پرستی اس کے لیے کافی نہیں ہے زمانہ کو اعتراف پر مجبور کرنے کے لیے اپنی فوقیت کا نقش قائم کرنے کے لیے اپنے ادارے کا احترام دلوں اور دماغوں میں پیدا کرنے کے لیے اپنے لیے وہ مناسب اور شایان شان مقام حاصل کرنے کے لیے آپ کو بڑی جد و جہد کرنا پڑے گی آپ کو اپنا معیار بلند کرنا پڑے گا اس زمانہ میں علم نے اگرچہ بڑی ترقی کی ہے اور اس میں بہت سے نئے میدان ہو گئے ہیں اور اس کی اہمیت اور وسعت میں برابر اضافہ ہو رہا ہے

لیکن اسی کے ساتھ علمی زندگی کی مشکلات کچھ ایسی ہیں زمانہ نے ایسی نئی کروٹ لی ہے اور ایسے انقلابات ملک میں پیش آچکے ہیں کہ اب محض علم کی وسعت محض تحریر کی شگفتگی محض خیالات کی بلندی اور نظریات کی جدت کافی نہیں ہے اب اس کے ساتھ بلند کردار کی اور درد مند و پر سوز دل کی بھی ضرورت ہے۔

معرکۂ افکار

اس وقت جو سب سے بڑا فیصلہ کن معرکہ عالم اسلام میں درپیش ہے اور جس میں بہت سے ممالک آزمائش کے دور سے گزر کر اس غلط منزل پر جا پہنچے ہیں جس کے تصور سے بھی ہمارے اسلاف کی نیندیں حرام ہوتی ہوگی اور بہت سے ممالک اب اس منزل کی طرف بہت تیزی سے گامزن ہیں وہ ہے۔ اسلام اور مغربیت کی کشمکش کا مسئلہ۔ اس وقت اس طبقے کے درمیان جس کے ہاتھ میں زمام حکومت ہے اور سواد اعظم اور عامۃ المسلمین کے درمیان ایک بہت بڑی ذہنی کشمکش برپا ہے اس وقت جس طبقے کے ہاتھ میں زمام کار آئی ہے وہ مغربی تہذیب کو مثالی اور انسانی تجربات کی آخری منزل اور حرف آخر سمجھتا ہے وہ اس کو زندگی کی تنظیم کی آخری کوشش سمجھتا ہے اور انسانی مسائل کے حل کا آخری کامیاب تجربہ سمجھتا ہے اور اس کو اسلام کے نظام کا قائم مقام خیال کرتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ اسلام کا نظام اپنی ساری افادیت کھو چکا ہے اب اس کو دوبارہ اس کارگاہ میں لانے کی زحمت دینا صحیح نہیں ہے یہ ہے وہ زندہ سوال جو اس وقت ایک شعلہ کی طرح ایک بھڑکی ہوئی آگ کی طرح تمام اسلامی ممالک میں پھیل چکا ہے اور جس کے اثر سے کوئی طبقہ اور کوئی لکھا پڑھا انسان پورے طور پر محفوظ نہیں۔

زمانہ حقیقت شناس

زمانہ بڑا حقیقت شناس ہے وہ صرف بلندی کے سامنے جھکتا ہے، دماغ 'بلند دماغ' کے سامنے جھکتے ہیں اور خالی اور سرد دل معمور اور گرم دلوں کا لوہا مانتے ہیں۔

سب سے بڑا فتنہ

آج مدارس کا سب سے بڑا فتنہ اور سب سے بڑا ذہنی طاعون بڑھتا ہوا احساس کہتری ہے جو گھن کی طرح اس درخت کو کھاتا چلا جا رہا ہے کسی ادارہ کو اگر یہ گھن لگ جائے تو پھر اس کی زندگی محال ہے۔

حقارت وذلت کا تعلق

آپ یاد رکھیں حقارت وذلت کا تعلق انسان کے اندر ون سے ہے عالم خارجی اور بیرونی دنیا سے بہت کم ہے حقارت ایک نفسیاتی کیفیت کا نام ہے احساس حقارت کا نتیجہ ہے کہ انسان کے شک وشبہ ضعف وتذبذب اور خود شناسی کے فقدان کا انسان خود اپنے کو حقیر و بے مایہ سمجھتا ہے اور اس کو دھوکہ ہوتا ہے کہ لوگ اس کو حقیر سمجھتے ہیں اور دنیا میں وہ بے قیمت اور ذلیل ہے حالانکہ یہ جفا وہ خود اپنے اوپر کرتا ہے یاد رکھئے جو خود اپنی نگاہ میں ذلیل ہو جائے اس کو کوئی باعزت نہیں بنا سکتا اور جو خود اپنے کو اپنی نظر سے گرا دے کسی کو اس کی بالکل ضرورت نہیں کہ اس کو اپنے دل یا آنکھوں میں جگہ دے جس کی گنجائش خود اپنے یہاں نہیں ہے اس کی گنجائش کون ومکان میں نہیں ہے یہ زمین بقدر دل سمٹتی اور پھیلتی ہے اور اس کی وسعت گھٹتی اور بڑھتی ہے آدمی کو یہ دیکھنا چاہیے کہ اس نے اپنے کو اپنے دل میں کیا مقام دیا ہے اور اس کا معاملہ خود اپنی ذات کے ساتھ کیا ہے اگر کسی نے اپنے کو ذلیل وحقیر مجبور بے بس تہی دست و بے بضاعت اور دنیا کے بازار میں بے قیمت و بے ضرورت سمجھ لیا ہے تو اس کو دنیا سے کسی انصاف اور کسی اعزاز کی توقع نہیں کرنی چاہیے حاتم طائی نے اسی حقیقت کو اس شعر میں بیان کیا ہے:

ونفسك أكرمها فانك ان تهن
عليك فلن تلقى من الناس مكرما

اپنی ذات کی خود کی عزت کرو اس لیے کہ اگر تم اپنی نگاہ میں ذلیل اور بے وزن ہو جاوگے تو پھر دنیا میں تمھیں کوئی بھی عزت کرنے والا نہیں ملے گا۔

احساس حقارت کے مریض

دوستو مجھے یقین ہے کہ ہم حقیر نہیں ہیں صرف احساس حقارت کے مریض ہیں اور یہ احساس حقارت ہماری خود ناشناسی اور خود فراموشی پر مبنی ہے اس کا علاج صرف یہ ہے کہ ہم اپنے مقام سے باخبر ہوجائیں اور اپنی دولت اور سرمایہ کا صحیح جائزہ لیں دنیا کی تبدیلی نگاہوں کی تبدیلی سب ہماری نگاہ کی تبدیلی کی تابع ہے جس دن ہماری یہ نگاہ بدلی دنیا بدل جائی گی اور یہ حقارت کا یہ مہیب سایہ جو ہمارے دل و دماغ پر مسلط ہے اور ہم کو ڈرا رہا ہے، کافور ہو جائیگا۔ کہنے والے نے کچھ غلط نہیں کہا:

اور اگر باخبر اپنی شرافت سے ہو
تیری سپہ انس وجن تو ہے امیر جنود

ہماری قدیم اور معاصر تاریخ میں جن اشخاص نے اپنے مقام کو پہچان لیا اور جن کو اس کا احساس ہو گیا کہ اللہ نے ان کو کون سی دولت دی ہے اور کس منصب پر سرفراز کیا ہے ان کو یہ سارا عالم پست نظر آنے لگا ان کو سلطنتیں نہیں خرید سکیں انہوں نے دنیا کی بڑی سے بڑی پیشکش سن کر ہمیشہ زیر لب مسکرا کر کہا:

برو ایں دام بر مرغ دگرنہ　　کہ عنقا را بلند است آشیانہ

انسانی تاریخ کی آبرو جو ارزاں فروشیوں اور خود فراموشیوں کی داستانوں سے داغدار ہے انہیں خود آشنا و خداشناس انسانوں کے دم سے ہے انسانیت کا سر انہیں کی بدولت اونچا ہے جنہوں نے اپنا سر ہمیشہ اونچا رکھا۔

ناقدانہ نظر

آپ کو نئے فتنوں سے واقف ہونا چاہیے مگر سطحی واقفیت عدم واقفیت سے زیادہ مضر ہے آج ہمارے مدارس میں فیشن کے طور پر بعض تحریکوں اور نظاموں کے نام لیے جاتے ہیں لیکن ان کے متعلق بہت کم معلومات ہیں ناقدانہ نظر اور محققانہ مطالعہ تو بڑی چیز ہے ان کی اجمالی حقیقت سے بھی واقفیت نہیں ضرورت ہے کہ ماہرین فن اور اہل نقد و نظر کی نگرانی اور رہنمائی میں ان کا مطالعہ کیا جائے اور نظام کی برتری ثابت کی جائے یہ کام مشکل ہے لیکن ضروری ہے اگر یہ مدارس کے اہتمام میں منظم طریقہ پر نہ ہوا تو وہ غیر منظم طریقہ پر ہوگا۔

نئے مطالعہ کی مشکلات

ہمارے مدارس میں نئے مطالعہ کا رجحان بھی بڑھ رہا ہے مگر مجھے اس کا اظہار کرتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ اس میں کوئی سنجیدگی اور گہرائی نہیں میں عصری مطالعہ کا بڑا داعی ہوں مگر بے تکلف کہتا ہوں کہ وہ اس قدر آسان اور سرسری کام ہے جتنا سمجھ لیا گیا ہے اس کے لیے کتابوں کے صحیح انتخاب و ترتیب پر پوری رہنمائی اور کسی اچھے مشیر کی رفاقت کی ضرورت ہے پھر اس سے پہلے اس کی ضرورت ہے کہ وہ ذہن تیار ہو جائے جو اس مطالعہ سے فائدہ اٹھا سکے معلومات میں صحیح ترتیب و نظام قائم کر سکے اور ان کو صحیح طور پر استعمال کر سکے اگر یہ ذہن صحیح تعلیم و تربیت اور اساتذہ کی صحبت سے تیار ہو گیا تو وہ ہر طرح کی پڑھی ہوئی چیزوں سے کام لے گا اور معلومات کے مواد خام سے کار آمد مصنوعات اور عظیم نتائج پیدا کریگا اور ادب تاریخ معلومات عامہ یہاں تک کہ بہت سی غیر متعلق چیزوں سے دین کی نصرت اور خدمت کا ایسا موثر اور حیرت انگیز کام لے گا جو بعض اوقات خالص دینی چیزوں سے نہیں لیا جا سکتا اس وقت ﴿مِنۡ بَيۡنِ فَرۡثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيۡنَ﴾ کی حقیقت کا ظہور ہوگا اگر ایسا نہیں دین کی بنیادیں قلب و دماغ میں مستحکم نہیں ہوئی ہیں ذہن کج اور ذوق

فاسد ہے تو ہر چہ گیرد علتی علت شود۔

عربی زبان پر قدرت

عربی زبان اس وقت ایک زندہ اور طاقتور زبان ہے عرب ملکوں میں وہ اپنے پورے عروج وشباب پر ہے وہ تصنیف و تالیف خطابت وتقریر سیاست وصحافت علم وفلسفہ اور دستور و قانون کی زبان ہے وہ پورے طور پر نکھر گئی ہے ہمارے عربی مدارس میں ایک غلط فہمی یہ پھیلی ہوئی ہے کہ قدیم عربی زبان تفسیر و حدیث وفقہ میں محدود ہے اور وہ کہیں اور نہیں پائی جاتی عربی کے نام سے بالکل نئی نام ایجاد ہوگئی جس میں زیادہ تر انگریزی وفرانسیسی کے معرب یا دخیل الفاظ ہیں اس غلط فہمی نے ہمارے بہت سے علماء اور نوجوانوں کو عربی سے متوحش اور مایوس بنادیا ہے آپ اگر مجھ پر۔ علامہ ندوی۔ اعتماد کر سکیں تو میں پورے وثوق کے ساتھ عرض کرونگا کہ جدید عربی کا کہیں وجود نہیں اس وقت جو زبان اہل علم اور اہل قلم شرق اوسط میں استعمال کرتے ہیں وہ قرآن وحدیث اور جاهلیت واسلام کی زبان سے،زیادہ سے زیادہ قریب ہے نئی ضرورتوں کے لیے بھی انھوں نے عربی کے قدیم ذخیرہ اور قرآن و حدیث سے الفاظ نکال لیے ہیں اس سلسلے میں انھوں نے جو کام انجام دیا ہے وہ حیرت انگیز بھی ہے اور قابل داد بھی مصر پر نپولین کے حملہ کے بعد سے جو مغربی الفاظ عربی زبان میں داخل ہوگئے تھے وہ ایک ایک کر کے بے دخل کیے گئے اور ان کی جگہ پر خالص عربی الفاظ رکھے گئے اس وقت ان ملکوں کا لسانی اور ادبی معیار اتنا بلند ہوگیا ہے اور صحافت واشاعت نے عربی کے خزانہ عامرہ کے نوادر کو ایسا وقف عام کردیا ہے کہ اب عربی میں کام کرنے کے لیے بڑی تیاری اور جد و جہد کی ضرورت ہے ہمارے مدارس میں جس انداز پر عربی زبان وادب کی تعلیم ہورہی ہے اس کے ساتھ ان ملکوں کوئی علمی خدمت یا دعوتی کام ناممکن ہے اگر آپ کو عربی دنیا میں دعوتی کام انجام دینا ہے یا ہندوستان کی دینی علمی تحریکات کا تعارف کرانا ہے، تو اس

کے لیے بڑے پیمانے پر تیاری کی ضرورت ہوگی۔

موجودہ عہد کی عام ضمیر فروشی

یہ عام ضمیر فروشی کا دور ہے بڑے بڑے فاضل اور صاحب قلم ہیں جن کی ذہانت اور مطالعہ کے سامنے ہماری کوئی حیثیت نہیں ہے لیکن ضمیر نام کی کوئی چیز ان کے یہاں نہیں پائی جاتی ان کے دماغ کے جگہ پر دماغ ہے اور دل کی جگہ پر بھی دماغ ہے بلکہ ان کے پہلو میں ایک دھڑکتے ہوئے دل کے بجائے ایک رواں دواں قلم رکھا ہوا ہے جو سب کچھ لکھ سکتا ہے جس کے یہاں آخرت کی جوابدہی اور ضمیر کی ملامت اور سرزنش کا کوئی سوال نہیں ان میں زمانہ کے ساتھ بدلنے اور اس کے مطالبوں کی ترجمانی کرنے کی غیر محدود صلاحیت ہے۔

نئی قیادت کی ضرورت

آپ یہاں مدرسہ سے مدرس بن کر نکلیں، مبارک آپ علمی متون کے شارح ہو، مبارک آپ واعظ وخطیب ہو مبارک آپ کتابوں کے مصنف ہو میں۔ علامہ ندوی۔ بھی اس کا گنہگار ہوں لیکن اس وقت زمانہ کو اس سے زیادہ کسی اور چیز کی ضرورت ہے اس وقت زمانے کو ان مردان کار کی ضرورت ہے جو اس نئی دور کو ایک نئی فکری قیادت ایک نیا دینی اعتماد ایک نئی روحانی واخلاقی قوت عطا کر سکے۔

جادو وہ ہے جو سر چڑھ کر بولے

علم میں کمال پیدا کرنا خواہ وہ کوئی علم ہو آپ کے لیے مفید ہے اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم عربی میں اور علوم دینیہ میں کمال پیدا کریں گے تو جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا؟ بھلا اس کمال کا قدر دان کون ہے؟ یہ آپ کی بے خبری کی بات ہے میں آپ کو بتاتا ہوں کہ یہاں سے لیکر امریکہ تک یورپ تک میک گل تک اور آکسفورڈ اور کیمبرج تک ہر جگہ اس علم کی قدر ہے

بشرطیکہ اس میں آپ نے کمال حاصل کیا ہو لیکن کمال کس کو کہتے ہیں کمال شد بد کو نہیں کہتے کمال کان یکون کو نہیں کہتے کمال اس کو نہیں کہتے کہ آپ عربی عبارت پڑھ لیں اور سمجھ لیں اس کا نام کسی نے بھی کمال نہیں رکھا کمال وہ ہے جسے کہتے ہیں کہ جادو وہ ہے جو سر چڑھ کر بولے کمال وہ ہے جو اپنا اعتراف کرالے میں آپ کو یقین دلاتا ہوں زمانہ کے انقلابات و تغیرات کی یہ سب داستانیں بالکل بے بنیاد ہیں یہ لوگ آپ کو بالکل دھوکہ دیتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ زمانہ بدل گیا ہے آپ کہاں ہیں کس چکر میں ہیں آپ کہاں اپنا وقت کھو رہے ہیں ارے بھائی کالج یونیورسٹی میں پڑھا ہوتا سائنس پڑھی ہوتی انگریزی لٹریچر پڑھا ہوتا آپ نے اکنامکس کا مطالعہ کیا ہوتا آپ نے فزکس کا مطالعہ کیا ہوتا آپ نے ٹیکنالوجی کی تعلیم حاصل کی ہوتی یہ سب ابلہ فریبی اور خام خیالی ہے اس کے سوا کچھ نہیں کمال آپ کس چیز میں پیدا کریں اور امتیاز حاصل کرلیں پھر آپ کو کبھی شکایت نہیں ہوگی کہ زمانہ ہم کو نہیں پوچھتا ہماری کوئی جگہ نہیں ہے آج جو کچھ بھی آپ دینی تعلیم کا انحطاط دیکھ رہے ہیں وہ بے کمالی کے وجہ سے ہے۔

اصل بات

اصل میں شکایت تو یہ ہے کہ آپ حضرات نے محنت کرنی چھوڑدی ہے آپ حضرات کے اندر ولولہ نہیں ہے مسابقت کا جذبہ نہیں ہے آپ حضرات کسی میں کامل ہونے اور درس کی قوت پیدا کرنے کو فخر کی چیز ہی نہیں سمجھتے اور ہمارے اسلاف ایسے تھے کہ ان کو بادشاہی ملتی ہوتی تو مدرسی کے خاطر اس کو وہ قبول کرنے کو تیار نہ تھے مدرس بننے میں وہ اتنا بڑا اعزاز سمجھتے تھے کہ وزارت کو ٹھکرادیں اور بعض بعض ایسے حضرات تھے کہ ہے وزیر اور درس دے رہے ہیں لکھنو میں وزیر آصف الدولہ کے زمانہ میں سعادت علی خان کے زمانہ میں ہر روز ان کے یہاں رات کو درس ہوتا تھا اور دن کو وزارت کا کام ہوا کرتا تھا ایسی بہت سی مثالیں آپ کو ملیں گی تفضل حسین علامہ ریاضی کے بہت بڑے عالم گذرے ہیں یہ وزیر اودھ تھے لیکن درس

اس طرح دیتے تھے کہ گویا صرف مدرس ہیں ایسی بہت ساری مثالیں ہیں لیکن ہمارے آپ کے اندر مدرس بننا وجہ افتخار نہیں رہا بلکہ ہم اس سے شرماتے ہیں کہ ہم مدرس بن جائیں تو ایک بات آپ سے یہ کہنا ہے کہ داخلی طور پر آپ استعداد درست کیجئے محنت کیجئے اور پتہ پانی کیجئے۔اور دل ماریئے اور کسی فن میں کمال پیدا کیجئے۔

جاہلیت کا پورا ماحول

اسلامی انقلاب کی عظمت اور اس کا محیر العقول کارنامہ اس وقت تک ذہن میں نہی آسکتا جب تک کہ جاھلیت کا پور ماحول اور اس کا نقشہ سامنے نہ ہو۔

مقدمہ نگار کے لیے

کسی کتاب پر مقدمہ لکھنے کے لیے مقدمہ نگار کا سلیم الفکر دقیق النظر اور وسیع المطالعہ ہونا کافی نہیں اس کی بھی ضرورت ہے کہ مقدمہ نگار کو کتاب کے موضوع سے ہمدردی اور اس کے نتائج بحث سے اتفاق ہو اور وہ مصنف کے مقصد کا پرجوش داعی اور وکیل ہو اس پر پورا یقین رکھتا ہو اور اس کی کامیابی کا دل سے متمنّی ہو۔

اجتماعی ادارہ کب زوال پذیر ہوتا ہے

یہ قاعدہ ہے کہ جب کوئی اجتماعی ادارہ زوال پذیر ہوتا ہے تو اس کے چلانے والے اس کی اور ارتقاء کو روک دینے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں پاتے۔

مصادر و مراجع

نمبر شمار	نام کتاب	مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ
۱	المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ	////
۲	انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر	////
۳	ارکانِ اربعہ	////
۴	اصلاحیات	////
۵	اپنے گھر سے بیت اللہ تک	////
۶	انسانیت کے محسنِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم	////
۷	ایک اہم دینی دعوت	////
۸	اسلامی بیداری کی لہر پر ایک نظر	////
۹	اسلام ایک تغیر پذیر دنیا میں	////
۱۰	امتِ اسلامیہ کا مستقبل خلیجی جنگ کے بعد	////
۱۱	اسماءِ حسنیٰ	////
۱۲	اسلام کا تعارف	////
۱۳	اسلام کے قلعے (مدارس دینیہ اور علماء ربانی کی ذمہ داریاں)	////
۱۴	انسانی علوم کے میدان میں اسلام کا انقلابی و تعمیری کردار	////
۱۵	اسلامیات اور مغربی مستشرقین و مسلمان مصنفین	////
۱۶	امتِ مسلمہ کی دوہری ذمہ داری	////

نمبر شمار	نام کتاب	مولانا سیّد ابوالحسن علی ندویؒ
۱۷	اسلامی ملکوں میں نظام تعلیم کی اہمیت	////
۱۸	اسلام کے تین بنیادی عقائد (توحید، رسالت، آخرت)	////
۱۹	انسانیت کی مسیحائی	////
۲۰	اجتماعی اجتہاد	////
۲۱	اسلام اور علم	////
۲۲	بصائر (برصغیر پاک و ہند کی عظیم دینی، اصلاحی تحریکات پر ایک اجمالی تعارف)	////
۲۳	پرانے چراغ	////
۲۴	پاجا سراغِ زندگی	////
۲۵	تاریخِ دعوت و عزیمت (جلد ا تا ٦)	////
۲۶	تعمیرِ انسانیت	////
۲۷	تذکرہ حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مراد آبادیؒ	////
۲۸	تزکیہ و احسان یا تصوف و سلوک	////
۲۹	تہذیب و تمدن پر اسلام کے اثرات و احسانات	////
۳۰	تبلیغ و دعوت کا معجزانہ اسلوب	////
۳۱	تحفۂ پاکستان	////
۳۲	تحفۂ دین و دانش	////
۳۳	تحفۂ کشمیر	////

نمبر شمار	نام کتاب	مولانا سیّد ابوالحسن علی ندویؒ
۳۴	تحفۂ مشرق	////
۳۵	تحفۂ دکّن	////
۳۶	تحفۂ برما	////
۳۷	تدوینِ فقہ اور چند اہم فقہی مباحث	////
۳۸	ترکی کے مجاہدِ ملّتِ اسلامی	////
۳۹	جب ایمان کی بہار آئی	////
۴۰	حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ اور ان کی دینی دعوت	////
۴۱	حدیث پاکستان	////
۴۲	حجازِ مقدس اور جزیرۃ العرب	////
۴۳	حیاتِ عبدالحئی	////
۴۴	حدیث کا بنیادی کردار	////
۴۵	حکومت کی تبدیلی سے سبق اور آئندہ کے لیے صحیح طریقۂ کار	////
۴۶	حجۃ الوداع کی شانِ یکتائی	////
۴۷	حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ	////
۴۸	خواتین اور دین کی خدمت	////
۴۹	خلفائے اربعہ	////
۵۰	دریائے کابل سے دریائے یرموک تک	////

نمبر شمار	نام کتاب	مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ
۵۱	دستورِ حیات	////
۵۲	دو متضاد تصویریں	////
۵۳	دو ہفتے ترکی میں	////
۵۴	دینِ حق اور علمائے ربانی	////
۵۵	دعائیں	////
۵۶	دو ہفتے مغرب اقصیٰ مراکش میں	////
۵۷	دین و شریعت	////
۵۸	دو آب دار موتی (بخاری شریف کی آخری حدیث)	////
۵۹	ذکرِ خیر	////
۶۰	رمضان المبارک اور اس کے تقاضے	////
۶۱	سیرت رسولِ اکرم ﷺ	////
۶۲	سیرتِ محمدی ﷺ دعاؤں کے آئینے میں	////
۶۳	سوانح حضرت عبد القادر رائے پوریؒ	////
۶۴	سوانح حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ	////
۶۵	سلاسلِ اربعہ، قادریہ، نقشبندیہ، چشتیہ، سہروردیہ	////
۶۶	صحبتے با اہلِ دل	////
۶۷	طالبانِ علومِ نبوت کا مقام اور ان کی ذمہ داریاں	////
۶۸	عالمِ عربی کا المیہ	////
۶۹	عصرِ حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح	////

نمبر شمار	نام کتاب	مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ
۷۰	علماء کا مقام اور ان کی ذمہ داری	////
۷۱	قادیانیت (اسلام اور نبوتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ایک بغاوت)	////
۷۲	قرآنی افادات	////
۷۳	قادیانیت کا ظہور	////
۷۴	کاروانِ زندگی	////
۷۵	کاروانِ ایمان و عزیمت	////
۷۶	کاروانِ مدینہ	////
۷۷	مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش	////
۷۸	منصبِ نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین	////
۷۹	معرکۂ ایمان و مادیت	////
۸۰	مغرب سے کچھ صاف صاف باتیں	////
۸۱	مذہب و تمدن	////
۸۲	مطالعۂ قرآن کے اصول و مبادی	////
۸۳	مکاتیب حضرت شاہ محمد الیاس	////
۸۴	مکاتیبِ یورپ	////
۸۵	مالیات کا اسلامی نظام	////
۸۶	ملک کا خطرناک رخ اور دانشور طبقہ کی ذمہ داری	////
۸۷	منصبِ رسالت	////

نمبر شمار	نام کتاب	مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ
۸۸	مدارس اسلامیہ ۔اہمیت و ضرورت اور مقاصد	////
۸۹	نبیٔ رحمت	////
۹۰	نقوشِ اقبال	////
۹۱	نئی دنیا	////
۹۲	نبیٔ خاتم و دینِ کامل	////
۹۳	نشانِ منزل	////
۹۴	ندوۃ العلماء ایک دبستانِ فکر، ایک رہنما تعلیمی تحریک	////
۹۵	نظامِ تعلیم مغربی رجحانات اس میں تبدیلی کی ضرورت	////
۹۶	ہندوستانی مسلمان (برصغیر پاک وہند کی تہذیب و تمدن کی تعمیر میں مسلمانوں کا حصہ)	////
۹۷	یورپ امریکہ اور اسرائیل	////

اشاریہ

ختم شد